قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اٹھہترواں سال

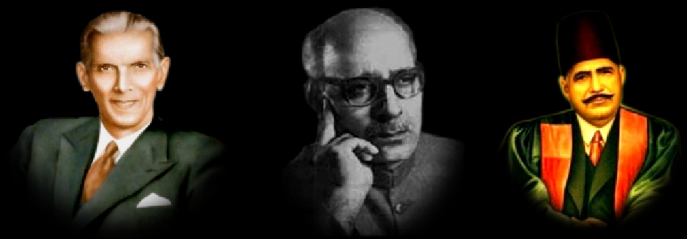
ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

جولائی 2021ء

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ِۨالْعَاكِفُ فِیْهِ وَالْبَادِ ؕ وَمَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۵﴾

یہ نظام، جس کے حسین و خوشگوار نتائج کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس کا مرکز کعبہ ہے۔ یہ وہ واجب الاحترام مقام ہے جو تمام انسانوں کے لئے، اطاعتِ خداوندی کا سرچشمہ قرار پائے گا۔ اسے ہم نے تمام نوعِ انسان کے لئے، خواہ وہ یہاں کے رہنے والے ہوں، یا باہر سے آنے والے، یکساں طور پر کھلا رکھا ہے۔ (اس کے دروازے، دنیا کے ہر ستائے ہوئے انسان کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں، اور سب اس کی منفعت بخشیوں میں شریک ہیں)۔ لیکن جو اس میں، ظلم و زیادتی کے ساتھ، حق کی راہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہوگا، اُسے اَلم انگیز سزا دی جائے گی۔

یہ لوگ اس نظام عدل و احسان سے خود بھی سرکشی برتتے ہیں، اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔ (ان کی اس دھاندلی کو کب تک برداشت کیا جا سکتا ہے؟ وقت آ گیا ہے کہ ان کی روک تھام کی جائے تاکہ اِنسانیت، ان کے جور و ستم سے امن میں رہے 21:39)۔ (مفہوم القرآن، سورۃ الحج 25:)

طلوعِ اسلام کا مقصد

جو احباب طلوع اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آگاہی کے لئے ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

1- تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

2- خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آسکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

3- قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

4- نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

5- دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہوسکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہوسکتا۔

6- رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

7- رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

جولائی 2021ء

جلد 74 | شمارہ نمبر 7

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: عیدالضحیٰ	ادارہ	4
بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن	پرویزؔ	8
اُسوۂ حسنہ (مسلسل)	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور	30
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا قرآنی مفہوم	خواجہ ازہر عباس، کراچی	41
بچوں کی تربیت: کیا واقعی بچے تو پل ہی جاتے ہیں؟	نبیلہ حارث، کراچی	43
پرویزؔ کا پیغام بچوں کے نام	محمد ارشد، سلیم اختر	51
دوقومی نظریہ پاکستان کی اِسلامی مملکت میں انسانی ذات کا ارتقاء	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	55

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Is Sexual Relationship a Private Matter? 61

By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

عیدالضحیٰ

جناب پرویز کی وہ تقریر جو دہلی ریڈیو سے 29 دسمبر 1941ء کی شام کو نشر ہوئی۔ قارئین طلوع اسلام کی خدمت میں بطور قند مکرر پیش کی جاتی ہے۔ (ادارہ)

مذہب کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک فرد کی ذاتی اصلاح کا ذریعہ ہے اس میں شبہ نہیں کہ افراد کی ذاتی اصلاح نہایت ضروری ہے لیکن یہ اصلاح اصل مقصد نہیں۔ عمدہ گھڑی کے ہر پرزہ کے لئے مضبوط اور درست ہونا ضروری ہے لیکن اگر یہ پرزے الگ تھلگ پڑے ہوں تو ان کی پائیداری اور مضبوطی کسی کام کی نہیں۔ یہی پرزے جب ایک نظام کے تحت، ایک خاص ترتیب سے، ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو ان میں سے ہر پرزہ کی حرکت، دوسرے پرزوں پر اثر انداز ہوگی اور اس طرح ان کی اس مجموعی حرکت کا جیتا جاگتا نتیجہ، محسوس شکل میں، گھڑی کے ڈائل پر نمودار ہو جائے گا۔ اسلام افراد کی اصلاح سے ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو نظامِ انسانیت کو عدل پر چلا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک ایسا عملی پروگرام مرتب کر دیا ہے جس میں ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ نماز کے لئے پانچ وقت کا اجتماع۔ تقویٰ۔ ضبطِ نفس۔ غیر اللہ کی محکومی سے انکار۔ اللہ کی حاکمیت کا اقرار۔ مرکزیت۔ اجتماعیت۔ اطاعتِ امام کا عملی مظاہرہ ہے۔ جمعہ کے اجتماع میں یہ دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ عید کی تقریب پر اس کی حدود اور زیادہ پھیل جاتی ہیں اور بال آخر حج کے میدان میں اس کی وسعتیں ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں۔ رمضانِ مبارک کے پورے مہینے کی مشق و ریاضت کے بعد جب ذہنوں میں جلا۔ دلوں میں تازگیٔ ایمان، نگاہوں میں مومنانہ فراست اور خون میں مجاہدانہ حرارت پیدا ہو گئی تو عیدالفطر کے اجتماع میں ہر مقام سے ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کے لئے بہترین افراد کا انتخاب ہوا۔ مسلم نمائندوں کے یہ قافلے دنیا کے دور دراز گوشوں سے جنگل، بیابان کوہ اور دریا کے مرحلوں کو طے کرتے ہوئے۔ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ اپنی بین الملی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے چاروں طرف سے ایک مرکز کی طرف سمٹے چلے آ رہے ہیں۔ دنیا میں کوئی جماعت بلا مرکز قائم نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں کے فکر و نظر کا مرکز قرآن۔ اطاعت کا مرکز امیر اور اجتماعیت کا مرکز وہ بیت الحرام ہے جو ایک خدا کے ماننے والوں کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے وجود میں آیا اور دنیا کے بتکدوں میں خدا کا پہلا گھر کہلایا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ۝ (3:96) بلاشبہ پہلا گھر جو تمام

انسانوں کے لئے (بطور مرکز) بنایا گیا ہے وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (3:97) جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن اور حفاظت میں آ گیا۔

اسلام دنیا میں جس نظام کو قائم کرنے کے لئے آیا ہے اس کی بنا اس اصول پر ہے کہ تمام انسان ایک برادری کے فرد ہیں وہ ان تمام غیر فطری حد بندیوں کو توڑنے کے لئے آیا ہے۔ جن سے انسانوں کی یہ برادری مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ نسل کا امتیاز۔ رنگ اور زبان کا امتیاز۔۔ جغرافیائی حدود کا امتیاز اس کے نزدیک سب غیر فطری حد بندیاں ہیں۔ اس لئے خدا کے اس گھر میں جب انسان جمع ہوں گے تو باطل کے ان امتیازات میں سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ چینی۔ جاپانی۔ ہندی۔ افغانی۔ ایرانی۔ تورانی۔ حبشی۔ افرنگی سب ایک ملت کی شکل میں اس عظیم الشان حقیقت کا اعلان کرنے کے لئے جمع ہوں گے کہ

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہی نہیں بلکہ۔ مختلف قسم کے لباسوں سے جو اعلیٰ اور ادنیٰ کے امتیاز کی جھلک نمودار ہو سکتی ہے اسلام نے اسے بھی روا نہیں رکھا اور حکم دے دیا کہ ارضِ حرم میں داخل ہونے سے پہلے سب ایک ایک بن سلی چادر میں لپٹے ہوئے حاضر ہوں۔

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

یہ ہے وہ وردی جو اسی بین الملی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ یوں باطل کے ہر امتیاز کو مٹاتے، وحدت کے رنگ میں رنگے یہ قافلے چاروں طرف سے، اپنے مرکز کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ سب ایک آقا کے غلام، ایک حاکم کے محکوم، ایک قانون کے تابع، ایک نظام کے پابند، فقیرانہ لباس، ننگے سر، گدایانہ وضع، قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال۔ دنیا بھر کے آستانوں سے بے نیاز، مستانہ وار گذرتے ہوئے ایک کی چوکھٹ پر سر جھکانے کے لئے بے تاب۔ دل وفور شوق سے بے قرار، آنکھیں مئے توحید سے نشہ بار لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ کہتے ہوئے یوں رواں دواں، جانب مرکز کھنچے چلے آ رہے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں، رنگ و بو کی فضاؤں کے جوہر اپنے سینوں میں بھر کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے شام کے وقت اپنے چھتے کی طرف پروانہ وار اڑتی چلی آ رہی ہوں کہ اپنی محنتوں کا سرمایہ، تگ و دو کا ماحصل۔ مرکز میں لا کر اکھٹا کر دیا جائے۔

زمانۂ ابراہیمیؑ میں رواج تھا کہ عہد و پیمان کی پختگی کے لئے ایک پتھر پر ہاتھ مارتے تھے۔ جب ان رہروانِ منزلِ شوق کے قافلے۔ حریمِ کعبہ میں پہنچے تو اس عہد و پیمان کی تجدید کے لئے جو انہوں نے اپنے اللہ سے باندھ رکھا ہے۔ حجر اسود کو چُھوا۔ بعض نے ہجوم کی وجہ سے دور ہی سے اشارہ کر دیا۔ کسی نے پیمان کے تقدس کی رعایت سے ہاتھ کو چوم لیا اور یوں اس عہد کی تجدید ہوئی کہ: اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾ (6:162-163) میری نماز، میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات

کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

اس عہد و پیمان کی تجدید سے، وجد و مسرت اور سرمستی و شیفتگی کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ والہانہ انداز میں خدا کے اس گھر کے گرد، پروانہ وار گھوم رہے ہیں۔ کوئی کعبہ کی چوکھٹ پر سر رکھے محوِ نیاز ہے، کوئی اس کا غلاف تھامے عالمِ وارفتگی میں جھولی پھیلائے کھڑا ہے۔ دل میں مقدس آرزوؤں کا ہجوم۔ آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو۔ لب پر دعائیں۔ محویت کا عالم۔ آسمان سے نور کی بارش۔ رحمتوں کا نزول۔ غرضیکہ ایک نئی دنیا اور ایک عجیب سماں ہے۔

خمخانۂ حجاز کے متوالوں کے یہ قافلے 8 تاریخ کو عرفات کے میدان کی طرف روانہ ہو گئے۔ پاک اور صاف، سر سے پاؤں تک للّٰہیت میں ڈوبے ہوئے۔ قدم وادیٔ مکہ میں۔ نگاہیں عرشِ معلیٰ پر، کوئی تیز گام کوئی آہستہ خرام۔ کشاں کشاں، 9 تاریخ کو اس میدان میں آ جمع ہوئے۔ کیسا حسین نظارہ ہے۔ سب ایک آقا کے غلام، ایک ملت کے فرد ایک ہی وضع، ایک ہی انداز، بھائی سے بھائی ملا۔ ایک کا دوسرے سے تعارف ہوا کہ اس مقام کا نام ہی عرفات کا میدان ہے، اجتماع کیا ہے؟ مساوات اور محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ جس میں ہر قطرہ، اپنے آپ کو خود سمندر محسوس کرتا ہے۔ یہ سب خدا کے حضور جمع ہوئے۔ ان کا منتخب امام منبر رسول اللہ ﷺ پر آیا۔ اس نے ملت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ کیا اور سال بھر کے لئے ایک مرتب شدہ پروگرام کا اعلان کر دیا۔ جس کی تکمیل کے لئے دعائیں مانگی گئیں، التجائیں کی گئیں اور یوں یہ عظیم الشان اجتماع۔ زندہ آرزوؤں کی ایک نئی دنیا اپنے جلو میں لئے۔ دوسری صبح منیٰ کے میدان میں آ گیا۔ یہی وہ میدان ہے جہاں ملتِ حنفیہ کے پیشوائے اعظم۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے پیشانی کے بل لٹا دیا تھا اور یوں اپنے ایمان محکم کا عملی ثبوت دیا تھا کہ تیرا حکم ہو تو عزیز ترین متاع بھی بلا تامل نثار کر دی جا سکتی ہے۔ اس صحرائی قربانگاہ میں پہنچ کر ملتِ اسلامیہ کے ان نمائندوں نے اس اقرار کو دہرایا کہ تیرا نام بلند کرنے کے لئے جو پروگرام مرتب ہوا ہے اس کی تکمیل میں جس قربانی کی ضرورت ہو گی بلا دریغ کر دی جائے گی۔ یہاں پہنچ کر مختلف ملکوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے خیمے لگائے۔ یہ سب اللہ کے مہمان ہیں اس لئے خود ہی مہمان اور خود ہی میزبان ہیں آج صبح ہندی مسلمانوں کے ہاں سب کے کھانے کا انتظام ہے شام کو ایرانیوں کا اہتمام ہے۔ ان دعوتوں کے لئے قربانیاں کی جا رہی ہیں۔ سامان تو کھانے پینے ہی کا ہے لیکن چونکہ وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے یہ اجتماع ہوا ہے خالصتاً اللہ کے لئے ہے اس لئے یہ دعوتیں بھی دنیا کی دعوتوں سے نرالی ہیں۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ (22:37) اللہ تک ان قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ بلکہ تمہارے دل کا تقویٰ۔ پاکیزگیٔ مقصد پہنچتی ہے۔ اس نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ تم اللہ کی راہنمائی پر اس کے نام کو بلند کرو۔ اور نیک کرداروں کے لئے بشارت ہے۔ دعوتیں اور ضیافتیں ہیں۔ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک والوں

کو اپنے مقامی حالات سے آگاہ کر رہے ہیں، دماغی اور قلبی تعارف ہو رہا ہے۔ ادھر ادھر مختلف ملکوں کی مصنوعات کی نمائش لگ رہی ہے۔ خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ (2:198) اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل (یعنی معیشت) کماؤ۔ اس طرح یہ اجتماع ملت اسلامیہ کے لئے دینی اور دنیاوی۔ سیاسی۔ اقتصادی۔ معاشی۔ معاشرتی فوائد کا ذریعہ بن رہا ہے کہ حج کا مقصد یہی ہے لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28) تاکہ لوگ اپنے فوائد کے لئے حاضر ہوں۔

تین دن تک یہ اجتماع رہا جس میں عالم اسلامی کے ہر گوشے اور ملت اسلامیہ کے ہر شعبے کے متعلق باہمی تبادلہ خیالات ہوا۔ ادھر یہ ہو رہا ہے۔ ادھر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ملت کے افراد۔ اپنے اپنے ہاں وادیٔ مکہ کے اجتماع سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے عیدگاہوں میں جمع ہو رہے ہیں۔ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے نیز اس پروگرام کو سننے کے لئے جس کا اعلان ایک دن پہلے میدان عرفات میں ہوا ہے۔ اس پروگرام کی اطلاعیں ریڈیو، ٹی وی، انٹرنیٹ اور تار برقی سے تمام عالم اسلامی تک پہنچ چکی ہیں۔ مقامی مسلمان عیدگاہوں میں پہنچے۔ اپنے اپنے خطیبوں سے اس پروگرام کو سن لیا اور سمجھ لیا جس پر اب سال بھر عمل کیا جائے گا۔ وہ تھا حج یہ ہے عید۔ وہ فریضۂ مقدس جس میں نوعِ انسانی کے قیام و بقاء کا راز ہے۔ تمام انسانوں کا اس لئے کہ مسلمان دنیا میں اپنے ہی لئے نہیں جیتا بلکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا کو اس نظام پر چلائے جس سے انسانیت بڑھے۔ پھولے۔ پھلے اور عروج و ارتقاء کی منزلیں طے کر کے، اس منزل سے اگلی منزل میں جا پہنچے۔ حج اس نظام کی سب سے اہم کڑی اور کعبہ اس نظام کا مرکز ہے۔ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (5:97)۔ اللہ نے کعبہ کو جو حرمت کا گھر ہے تمام انسانوں کے لئے (امن و عافیت کے) قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ انسانوں نے مختلف خطوط پر مختلف قسم کی جمعیتیں بنا بنا اور بگاڑ بگاڑ کر مختلف تجربے حاصل کئے ہیں اور ہر تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ۔۔۔ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی۔۔۔ یہ سب اس لئے کہ جن اصولوں پر یہ جمعیتیں بنائی گئیں وہ سب غیر فطری تھے۔ فطرت کے مطابق تو ایک ہی اصول ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کی تقسیم ملکوں اور قوموں کی رو سے نہ کی جائے بلکہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری تصور کر کے انہیں ایک مرکز کے ماتحت خدا کے قانون کے تابع رکھا جائے۔ یہی وہ عظیم الشان اصول ہے جس کی رو سے مکہ کو ''هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ'' تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ اور کعبہ کو ''قِيٰمًا لِّلنَّاسِ'' تمام نوع انسانی کے قیام کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس جمعیت آدم کا فطری نتیجہ ہے، دنیا کا امن و سکون۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (3:97) جو اس میں داخل ہوا۔ امن و حفاظت میں آ گیا حج اور عید اسی منزل کے نشانِ راہ ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن

علمائے حیاتیات اور علم النفس، اس پر متفق ہیں کہ تحفظ (Self Preservation) کا جذبہ ہر ذی حیات میں، جبلی طور پر پایا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ جبلی جذبات میں اسے بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسی جذبہ کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی ہر متاع عزیز کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ جب انسانوں نے مل جل کر تمدنی زندگی بسر کرنی شروع کی، تو ان کے مفاد میں تصادم ہونے لگا۔ اس سے انہوں نے محسوس کیا کہ، انفرادی زندگی بسر کرنے سے، ان کی وہ چیزیں محفوظ نہیں رہ سکتیں جنہیں وہ اپنی متاع عزیز اور سرمایہ گراں بہا سمجھتے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے۔۔۔ اجتماعی نظم ونسق کا تصور وضع کیا، جسے اب حکومت کہا جاتا ہے۔ اس نظم اجتماعی کا مقصد اولین یہ تھا کہ افراد کی وہ چیزیں محفوظ رہیں جنہیں وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔

حکمران طبقہ کے حقوق:

حکومت کی بنیاد تو اس مقصد کے تحت رکھی گئی تھی لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ تلخ حقیقت سامنے آ گئی کہ حکمران طبقہ کے ہاتھوں لوگوں کا کوئی حق بھی محفوظ نہیں رہا۔ اس طبقہ نے تقسیم یوں کی کہ حقوق سب کے سب، ارباب حکومت کے ہیں اور ذمہ داریاں تمام کی تمام رعایا کی۔ لوگ اس تقسیم کو گوارا نہ کرتے لیکن مذہبی پیشوائیت آگے بڑھی اور یہ کہہ کر عوام کو اس تقسیم کے سامنے جھکا دیا کہ راجہ ایشور کا اوتار ہوتا ہے۔ بادشاہ خدائی حقوق (Divine Rights) کا حامل ہوتا ہے۔ سلطان زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے، اس لیے فرماں روائی اس کا حق اور اطاعت گزاری تمہارا فریضہ ہے۔ وہ جو کچھ تمہیں دے، اس کی عنایت اور احسان ہے۔ تم اس سے بطور حق کچھ نہیں مانگ سکتے۔ تم اس کے حضور جھکو۔ اسے سجدے کرو۔ اس کی خیریت کی دعائیں مانگو۔ اس کے ہر حکم کی اطاعت کرو، اور اس اطاعت کو اپنے لیے سرمایۂ ہزار سعادت سمجھو۔ تم اور جو کچھ تمہارا ہے، وہ اُس سب کا مالک ہے۔ اسے ان تمام چیزوں پر کلی اختیار حاصل ہے۔ وہ تمہارا ان داتا (رازق) اور پالن ہار (پروردگار) ہے۔ تم اس سے خیرات مانگ سکتے ہو۔ کوئی شے بطور حق کے طلب نہیں کر سکتے۔

> اپنے حکم کو دوسروں سے منوانا، انسان کی فطرت میں داخل ہے۔'' لیکن اس کے ساتھ ہی ''قیام امن'' بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے لیکن یہ دونوں باتیں یک جا نہیں رہ سکتیں۔ جب ہر فرد، اپنا حکم دوسروں سے منوانے پر تل جائے تو امن کہاں باقی رہ سکتا ہے۔

حاکم اور محکوم کے باہمی تعلق کا یہ تصور اسی طرح چلا آ رہا تھا کہ سترہویں صدی عیسوی میں، یورپ کے سیاسی نظریات میں ایک انقلاب آیا جس کی رو سے، اس تعلق کو از سرِ نو متعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ کہا یہ گیا ہے کہ ان دونوں (فریقوں) کا تعلق، ایک معاہدہ کی رو سے متعین ہونا چاہیے۔ اسے نظریہ میثاق (Contract Theory) کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ:

1۔ تمدنی زندگی بسر کرنے سے پہلے انسان فطری حالت پر تھا۔

2۔ اس فطری حالت میں انسان کچھ حقوق رکھتا تھا جنہیں ہنوز کسی نے غصب نہیں کیا تھا۔

3۔ جب انسان کو اپنے فطری حقوق کے تحفظ کے لیے خطرہ لاحق ہوا تو اس نے معاشرتی زندگی اختیار کی۔ لہٰذا، معاشرہ (سوسائٹی) کا وجود، انسان کے فطری حقوق کے تحفظ کے جذبہ کا رہین منت ہے۔

4۔ بنابریں، معاشرہ کا فریضہ ہے کہ انسان کے فطری حقوق کا تحفظ کرے۔

5۔ ان فطری حقوق کا نام ہے۔ ''بنیادی حقوق انسانیت''

مغربی مفکرین کے نظریات:

اس نظریہ کا اولین داعی، یورپ کا مشہور مفکر ہابزؔ (Hobbes 1588-1679) تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ''اپنے حکم کو دوسروں سے منوانا، انسان کی فطرت میں داخل ہے۔'' لیکن اس کے ساتھ ہی ''قیام امن'' بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے لیکن یہ دونوں باتیں یک جا نہیں رہ سکتیں۔ جب ہر فرد، اپنا حکم دوسروں سے منوانے پر تل جائے تو امن کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ لہٰذا، انسان کو، اس دوسرے مقصد کے حصول کے لیے، اپنے پہلے حق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ بنابریں، ہابزؔ کے نزدیک، قیام امن انسان کا واحد بنیادی حق ہے جس کے لئے وہ اپنے ہر دیگر حقوق سے دستبردار ہو جاتا ہے۔

نظریہ میثاق کا دوسرا علمبردار لاکؔ (Locke 1632-1704) ہے۔ اس کے نزدیک، انسان کے بنیادی حقوق ''زندگی، صحت، آزادی، اور املاک'' ہیں ان کے تحفظ کے لیے انسان صرف، اپنا ایک حق چھوڑتا ہے، اور وہ ہے، متنازعہ فیہ معاملات میں خود فیصلہ کرنے کا حق۔ لاکؔ کہتا ہے کہ افراد کو چاہیے کہ اپنے اس حق کو معاشرہ کے سپرد کر دیں، اور اس کے بعد معاشرہ کا فریضہ ہے کہ وہ افراد کے دیگر حقوق کا تحفظ کرے۔

چونکہ ہابزؔ اور لاکؔ کے ہاں، بنیادی حقوق کا تصور ان کے نظریہ میثاق کی ایک ذیلی شق کے طور پر آتا ہے، اس لیے یہ (تصور) کچھ ایسا واضح اور متعین نہیں۔ اسے، ایک جداگانہ اور مستقل نظریہ کی حیثیت سے (Tom Paine, 1739-1809) نے پیش کیا۔ جس کی کتاب (Rights of Man) آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ اس نے ''زندگی، آزادی، املاک، حفاظت اور استبداد کی روک تھام'' کو بنیادی حقوق انسانیت قرار دیا ہے۔ یہی تھے وہ حقوق، جنہیں، انقلاب فرانس کے بعد، فرانس کی نیشنل اسمبلی نے اپنے چارٹر میں درج کیا تھا امریکہ کا منشور آزادی (1774ء)

بھی، پین ہی کے فطری حقوق کے نظریہ پر مبنی تھا۔ اس میں زندگی اور آزادی کے ساتھ ''حصول مسرت'' کو بھی بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ 1918ء میں روس کی کانگریس نے مزدوروں اور کسانوں کے سلسلہ میں بنیادی حقوق کا ایک منشور مرتب کیا جس میں کہا گیا کہ ''اس منشور سے مقصود یہ ہے کہ ایک انسان، کسی دوسرے انسان کو لوٹ نہ سکے۔ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے، اور تمام دنیا میں معاشرہ کی تشکیل، اشتراکی خطوط پر کی جائے۔''

مجلس اقوام متحدہ:

کوئی چالیس سال ادھر کی بات ہے، مجلس اقوام متحدہ (U.N.O) نے (Human Rights Commission) کے نام سے ایک تحقیقاتی بورڈ مقرر کیا تھا کہ وہ کامل غور وخوض کے بعد، سفارشات کرے کہ انسانیت کے بنیادی حقوق کیا ہیں۔ ان سفارشات کو (U.N.O) نے جانچا اور پرکھا اور اس کے بعد 1948ء میں وہ چارٹر شائع کیا جسے ''منشور حقوق انسانیت'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کی اس کوشش کو، اس وقت تک اس باب میں حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔ جو حقوق اس چارٹر میں درج ہیں، وہ مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہیں۔

> چارٹر میں یہ تحریر ہے کہ ان حقوق، اور اختیارات کو ان حدود کے تابع استعمال کیا جاسکتا ہے جو، مختلف ممالک میں از روئے قانون عائد کی جائیں۔۔۔ چونکہ، اپنی اپنی منشاء کے مطابق قوانین سازی کا حق ہر ملک کو حاصل ہے، اس لیے ان قوانین کے تابع، ''بنیادی حقوق انسانیت'' کی جو حیثیت رہ جاتی ہے، وہ ظاہر ہے۔۔۔

1۔ تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور بنیادی حقوق کے یکساں حقدار ہیں۔
2۔ زندگی، آزادی اور حفاظت جان کا حق۔
3۔ غلامی کی ممانعت۔
4۔ بے رحمی کے سلوک سے حفاظت کا حق۔
5۔ قانون کے معاملہ میں یکساں سلوک کا حق۔
6۔ کسی شخص کو بلا قصور گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ نہ نظر بند یا جلاوطن کیا جائے گا۔
7۔ جب تک الزام ثابت نہ ہو، ملزم کو بے قصور تصور کیے جانے کا حق۔
8۔ معاملاتِ زندگی اور خط وکتابت میں عدم مداخلت کا حق۔
9۔ نقل وحرکت کی آزادی۔
10۔ ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا بسنے کی آزادی۔
11۔ حقِ قومیت۔
12۔ شادی کا حق۔

13۔حقوقِ جائیداد۔

14۔خیالات،ضمیر اور مذہب کی آزادی، نیز اظہار خیالات اور اجتماعات میں شرکت کی آزادی۔

15۔اپنے ملک کی حکومت میں شرکت کا حق۔

16۔تعمیر خویش کے لیے وسائل وذرائع کی آزادی۔

17۔حسب منشاء کام کاج کی آزادی۔

18۔آرام اور فرصت کی آزادی، نیز معیار زندگی اور تعلیم کا حق۔

19۔جماعتی اور ثقافتی زندگی میں شرکت کا حق۔

یہ ہے مختصراً ان حقوق کی فہرست جسے اقوام عالم کے نمائندگان نے اپنے۔۔۔مسلمہ چارٹر میں داخل کر رکھا ہے۔ان حقوق سے کن شرائط کے تحت بہرہ یاب ہوا جاسکتا ہے۔اس کے متعلق ذرا آگے چل کر ذکر کیا جائے گا۔سردست اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ اس فہرست کے بعد چارٹر میں یہ تحریر ہے کہ ان حقوق، اور اختیارات کو ان حدود کے تابع استعمال کیا جاسکتا ہے جو،مختلف ممالک میں از روئے قانون عائد کی جائیں۔۔۔چونکہ، اپنی اپنی منشاء کے مطابق قوانین سازی کا حق ہر ملک کو حاصل ہے،اس لیے ان قوانین کے تابع ''بنیادی حقوق انسانیت'' کی جو حیثیت رہ جاتی ہے،وہ ظاہر ہے۔۔۔

قرآن کا اعلان:

یہ ہے، اجمالی سا تذکرہ ان کوششوں کا جو انسان کے بنیادی حقوق متعین اور تسلیم کرنے کے سلسلہ میں، انسانی فکر نے آج تک کی ہیں۔اب ان کے مقابلہ میں اس ضابطہ حقوق کو سامنے لایئے جو چھٹی صدی عیسوی میں۔۔۔جب دنیا،انسان کے بنیادی حقوق کے تصور تک سے نا آشنا تھی۔۔۔تمام نوع انسان کی راہ نمائی کے لیے خدا کی طرف سے دیا گیا،اور جس پر عمل کر کے اس ضابطہ آسمانی کے لانے والے،پیغمبر آخر الزمان ﷺ نے،دنیا کو پہلی بار اس حقیقت کبریٰ سے روشناس کرایا کہ دنیا میں انسان کا مقام کیا ہے اور اس کے وہ حقوق کیا ہیں جنہیں دنیا کی کوئی طاقت چھین نہیں سکتی۔ان حقوق کا تفصیلی تذکرہ،اس مختصر سے وقت میں مشکل ہے،اس لئے میں ان کے اجمالی تعارف پر ہی اکتفا کروں گا۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ (11:88)

اس مقام پر سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانی فطرت (Human Nautre) کا تصور ہی غلط ہے۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔فطرت سے مراد ہوتی ہیں کسی چیز کی وہ خصوصیات جو اس شے کے اندر مضمر ہوں اور جنہیں نہ اسے بدلنے کا اختیار ہو اور نہ ہی ان کی خلاف ورزی کی مقدرت۔(مثلاً) حرارت پہنچانا آگ کی فطرت ہے۔نشیب کی طرف بہنا پانی کی فطرت ہے۔وہ نہ انہیں بدل سکتی ہیں نہ ہی ان کی خلاف ورزی کرسکتیں ان کے برعکس انسان کو صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لیے اس کی کوئی فطرت ہو نہیں سکتی۔حیوانات کے کچھ طبعی تقاضے ہوتے ہیں، جنہیں۔۔۔ (Instincts) یا جبلّت کہا جاتا ہے۔(یعنی وہ تقاضے جو جبل، پہاڑ کی طرح اپنے مقام پر اٹل اور محکم ہوں)۔یہی تقاضے

انسان کی طبعی زندگی (Physical Life) کے بھی ہیں۔ لیکن یہ ان کی خلاف ورزی بھی کرسکتا ہے مثلاً اپنی زندگی کی حفاظت کرنا، ہر ذی حیات کا جبلی تقاضا ہے جس کی خلاف ورزی کوئی حیوان نہیں کرتا۔ لیکن انسان خودکشی بھی کرسکتا ہے۔ بنابریں، انسان کے فطری حقوق کا تصور غلط ہے۔ چنانچہ اب مغرب کے مفکرین بھی اس حقیقت کو تسلیم کیے جارہے ہیں کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ حیوانات کی طرح اس کی طبعی زندگی کے کچھ تقاضے ہیں۔

حیوانات کے تقاضے تو ان کی طبعی زندگی کے تقاضوں تک محدود ہیں۔ لیکن انسان کے تقاضے، اس کے طبعی تقاضوں سے ماوراء بھی ہیں۔ مثلاً عزت نفس (Self Respect) کا تقاضا۔ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق طبعی زندگی سے نہیں، اس لیے حیوانات کو اس کا شعور تک نہیں ہوتا یہ خالص انسانی تقاضا ہے۔ تصریحات بالا سے واضح ہے کہ انسانی حقوق کا تعلق انسان کی طبعی زندگی کے تقاضوں سے بھی ہوگا اور اس کی انسانی زندگی سے بھی۔ جہاں تک اس کی طبعی زندگی کے تقاضوں کا تعلق ہے، ان کا معلوم اور متعین کرنا کچھ مشکل نہیں۔ ان کا ہر انسان کو خود علم ہوتا ہے۔ لیکن انسانی تقاضوں کی یہ کیفیت نہیں۔ یہ نہ (جبلت کی طرح) انسان کے اندر ہوتے ہیں، اور نہ ہی متعین (مثلاً) جنسی اختلاط کا تقاضا طبعی زندگی سے متعلق ہے۔ اس کا ہر ایک کو علم ہوتا ہے لیکن عصمت کی حفاظت کے تقاضے کی یہ کیفیت نہیں عصمت کا تصور مختلف اقوام میں مختلف ہے۔ یہ وجہ ہے جو انسانی فکر کی رو سے بنیادی حقوق انسانی کا کوئی عالمگیر چارٹر مرتب نہیں ہوسکتا اور اسی لیے اقوام متحدہ (U.N.O) کو ایک ماڈل چارٹر مرتب کرنے کے ساتھ ہی یہ کہنا پڑا کہ اس پر عمل، ہر ملک اپنے اپنے قوانین کے تابع کرے گا۔

جنسی اختلاط کا تقاضا طبعی زندگی سے متعلق ہے۔ اس کا ہر ایک کو علم ہوتا ہے لیکن عصمت کی حفاظت کے تقاضے کی یہ کیفیت نہیں عصمت کا تصور مختلف اقوام میں مختلف ہے۔ یہ وجہ ہے جو انسانی فکر کی رو سے بنیادی حقوق انسانی کا کوئی عالمگیر چارٹر مرتب نہیں ہوسکتا۔

قرآن کریم تمام انسانوں کے لیے (عالمگیر) ضابطہ زندگی ہے اس لیے وہ بنیادی حقوق انسانیت کا ایسا منشور دیتا ہے جس میں انسان کی طبعی زندگی کے تقاضے بھی شامل ہیں اور اس کی انسانی زندگی کے تقاضے بھی جنہیں وحی کی رو سے متعین کیا گیا ہے اس کا اطلاق ان تمام اقوام پر یکساں ہوگا جو قرآن پر ایمان رکھتی ہوں۔ اس اعتبار سے یہ غیر متبدل۔ ابدی اور عالم گیر ہے۔

ان تمہیدی تصریحات کے بعد آگے بڑھیے۔

❁❁❁

قرآنی نظریہ میثاق:

سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ نظریہ میثاق، جسے عصر حاضر کی سیاسی فکر کا معرکہ آراء کارنامہ قرار دیا جاتا ہے، کا تصور بھی قرآن کریم ہی نے پیش کیا تھا لیکن وہ اس میثاق کو، حاکم اور محکوم میں استوار نہیں کرتا۔۔۔ اس کے نزدیک انسانوں میں حاکم اور محکوم کا تصور ہی باطل ہے۔ جیسا کہ ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا، اس کی رو سے، کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ

دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ وہ اس میثاق کو خدا اور بندوں کے درمیان معاہدہ قرار دیتا ہے۔ لیکن اس میثاق کے لیے خدا خود بندوں کے سامنے نہیں آتا، اس لیے یہ میثاق افراد، اور اس معاشرہ کے درمیان طے پاتا ہے جو نظام خداوندی کو متشکل کرنے کے لیے وجود میں آتا ہے۔ اسے خلافت یا قرآنی مملکت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میثاق کے الفاظ یہ ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَاَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ (9:111)

افراد معاشرہ (مومنین) اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ دنیا میں نظام عدل واحسان کے قیام اور استحکام کی خاطر ان کا مال اور ان کی جان، نظام خداوندی کے سپرد ہوں گے اور نظام خداوندی ان سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں، اس کے عوض ''الۡجَنَّۃَ ؕ'' عطا کرے گا۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے'' الۡجَنَّۃَ ؕ '' میں وہ تمام خوش حالیاں اور خوش گواریاں۔۔ سرفرازیاں اور سربلندیاں۔ اطمینان اور سکون۔ امن اور سلامتی۔ غرضیکہ وہ سب کچھ آجاتا ہے جس کی انسان آرزو کرسکتا ہے۔ اس میثاق کی رو سے، ان تمام چیزوں کا حصول، ان لوگوں کا بنیادی حق ہوجاتا ہے۔ قرآن کریم نے جنتی معاشرہ کی جو تفاصیل بیان کی ہیں، اگر میں ان کا ذکر کروں تو اس سے ایک ایسی جامع فہرست مرتب ہوجائے گی جسے ان افراد معاشرہ کے بنیادی حقوق کا چارٹر سمجھا جائے گا۔ لیکن میں اس وقت، اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اس لیے کہ یہ حقوق ان لوگوں کے ہوں گے جو اس میثاقِ خداوندی کا ایک فریق ہوں گے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور میرا موضوع، ان حقوق سے متعلق ہے جو قرآن کی رو سے دنیا کے ہر انسان کو، محض انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں۔ یہ حقوق، کسی معاہدہ یا میثاق سے مشروط نہیں ہوں گے۔ نہ کسی خدمت کا معاوضہ۔ یہ بلامشروط ہوں گے اور بلامزد ومعاوضہ، ہر انسان کو۔۔۔ بلاتخصیص مذہب، ملت، زبان، رنگ، نسل، وطن، محض انسان ہونے کی جہت سے حاصل ہوں گے۔ دیکھئے یہ حقوق کیا ہیں، جنہیں ہر انسان قرآنی معاشرہ سے، طلب کرسکتا ہے۔

1۔ احترام آدمیت:

پہلا حق یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، پیدائش کے اعتبار سے یکساں طور پر عزت کا مستحق ہے۔ وَلَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70) قرآن کا ارشاد ہے۔ یعنی ''ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔'' لہٰذا، پیدائش (حسب، نسب، ذات برداری وغیرہ) کے اعتبار سے انسان اور انسان میں فرق۔ امارت اور غربت کے لحاظ سے انسانوں میں تمیز۔ کسب وہنر اور پیشوں کے اعتبار سے انسانوں میں تفریق اس پیدائشی حق کے خلاف ہے۔ مختصر الفاظ میں، انسان کی تذلیل، خواہ کسی جہت سے ہو، اس حق کی خلاف ورزی ہے۔ ''آدمیت، احترام آدمی'' قرآن کا پہلا اصول ہے اور ہر انسان کا اولین بنیادی حق، بلامشروط۔

2۔ جنسی مساوات:

قرآن کریم کی رو سے، جنسی تفریق نہ وجہ ذلت ہے نہ باعثِ امتیاز۔ یعنی نہ مرد، محض مرد ہونے کی حیثیت سے، عورتوں

سے افضل ہیں، اور نہ ہی عورتیں، محض عورت ہونے کی بنا پر، مردوں سے کمتر۔ زندگی کی ابتداء، نفس واحدہ سے ہوئی ہے۔(4:1) قرآن کا ارشاد ہے۔ ہر انسانی بچہ میں۔خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ کچھ حصہ مرد کا ہوتا ہے اور کچھ حصہ عورت کا۔ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى (49:13) اس لیے نہ مرد، عورتوں سے الگ کوئی نوع ہیں، نہ عورتیں، مردوں سے الگ کوئی جنس۔ دونوں نوع انسان کے افراد ہیں، اور جس مقام کا مستحق ایک انسان ہے، اس میں مرد اور عورت، دونوں یکساں طور پر شریک ہوتے ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے دروازے ایک صنف کے لیے کھلے رکھیں جائیں، اور دوسرے پر بند کر دیئے جائیں۔ حیاتیاتی طور پر۔۔۔(Biologically) مرد اور عورت کی ساخت میں جو فرق ہے اس کا تعلق ان کے طبعی وظائفِ حیات سے ہے۔ انسانیت کی سطح پر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں عمل کا میدان دونوں کے لیے یکساں ہے، اور عمل کے نتائج بھی یکساں لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ ۔۔۔(3:195) تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کا اجر ضائع نہیں ہوسکتا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔۔۔ مرد اور عورت کی تخصیص کے معنی کیا ہیں؟ تم ایک دوسرے کے اجزاء ہو۔ تم خلقت کے اعتبار سے ایک ہو۔۔ زندگی کے تمام معاملات میں یکساں طور پر شریک رہتے ہو۔ تم ایک نوع کے فرد ہو۔ پھر آیات (33:35) و(9:71) میں دیکھئے۔ قرآن کریم کس طرح مردوں اور عورتوں کو زندگی کے ہر میدان میں دوش بدوش گامزن بناتا ہے۔

لہٰذا، جنسی مساوات، انسانیت کا بنیادی حق ہے جسے کسی صورت میں بھی غصب نہیں کیا جاسکتا۔ قرآنی معاشرہ اس حق کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار ہے۔

> ارباب اقتدار، جنہیں قانون سازی کا اختیار حاصل ہوتا ہے، جس قدر ظلم اور زیادتی، قانون کے پردے میں کرسکتے ہیں، لاقانونیت کا استبداد اس کے سامنے ہیچ ہوتا ہے۔ لاقانونیت کے دور میں یہ استبداد کھلے بندوں ہوتا تھا، اور اس دورِ دستور و آئین میں یہ، قانون سازی کی رسم ادا کرلیتا ہے، اور پھر یہ، شاہ مدار کی بسم اللہ پڑھ کر پھونکی ہوئی چھری، جس جانور کے گلے پر پھیر دی جائے وہ ذبیحہ حلال قرار پاجاتا ہے۔

3۔ مدارج علیٰ قدرِ اعمال:

احترام آدمیت کے بعد، معاشرہ میں مختلف افراد کے مدارج کا سوال سامنے آتا ہے اس کے لیے اصول یہ ہے کہ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۔۔(46:19)۔ ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ، اس کے اعمال و کردار کے مطابق متعین کیا جائے گا۔ یعنی سب سے پہلے ہر انسان کی عزت بحیثیت انسان ہوگی، اور اس کے بعد اس کے جوہرِ ذاتی اور حسنِ سیرت و کردار کو دیکھا جائے گا، اور ان کے مطابق سوسائٹی میں اس کا مقام اور درجہ مقرر کیا جائے گا۔ جو جتنی زیادہ خوبیوں کا مالک، وہ اتنے ہی اونچے مقام کا مستحق۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۔۔۔(49:13) جو

سب سے زیادہ حسنِ عمل کا پیکر، وہ سب سے زیادہ واجب العزت۔ نیچے سے لے کر اوپر تک، عزت کا ہر مقام ہر شخص کے لیے کھلا ہوگا، جسے وہ، اپنی قابلیت اور حسن سیرت کی رو سے بطور حق حاصل کر سکے گا۔ اس کا یہ حق اس سے کوئی نہیں چھین سکتا، نہ ہی تعینِ مدارج کا کوئی اور معیار مقرر کیا جا سکتا ہے۔

4۔ حق آزادی:

''آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔'' یہ نعرہ اور اعلان تو آپ نے ہر جگہ سے بلند ہوتا سنا ہوگا لیکن اس کا صحیح مفہوم بہت کم سامنے آیا ہوگا۔ جس جگہ سے آپ نے یہ نعرہ بلند ہوتے دیکھا ہوگا، وہیں سے آپ نے آئے دن ایسے احکام نافذ ہوتے بھی دیکھے ہوں گے جو ہر شخص کی آزادی پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرتے چلے جائیں۔ لہٰذا، یہ بات کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ اگر آزادی، انسان کا پیدائشی حق ہے، تو پھر اس پر یہ پابندیاں کیوں عائد کی جاتی ہیں؟ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ پابندیاں قانون کی رو سے عائد کی جاتی ہیں اور قانون کی رو سے عائد کردہ پابندیاں، انسانی آزادی کو سلب نہیں کرتیں۔ اس لیے کہ اگر پابندیاں عائد نہ کی جائیں تو کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے۔۔۔ لہٰذا صحیح آزادی کے لئے قانونی پابندیاں لاینفک ہیں۔ یہ درست ہے کہ معاشرہ کے قیام اور افراد کی حفاظت کے لیے قانونی پابندیاں ضروری ہیں، لیکن یہ بھی تو ظاہر ہے کہ ارباب اقتدار، جنہیں قانون سازی کا اختیار حاصل ہوتا ہے، جس قدر ظلم اور زیادتی، قانون کے پردے میں کر سکتے ہیں، لاقانونیت کا استبداد اس کے سامنے ہیچ ہوتا ہے۔ لاقانونیت کے دور میں یہ استبداد کھلے بندوں ہوتا تھا، اور اس دورِ دستور و آئین میں یہ، قانون سازی کی رسم ادا کر لیتا ہے، اور پھر یہ، شاہ مدار کی بسم اللہ پڑھ کر پھونکی ہوئی چھری، جس جانور کے گلے پر پھیر دی جائے وہ ذبیحہ حلال قرار پا جاتا ہے۔ یہ سوال بڑا اہم اور بنیادی ہے جس کا دنیا کو آج تک خاطر خواہ حل نہیں مل سکا کہ انسانی آزادی اور قانونی پابندی میں ایسی مفاہمت کی صورت کس طرح پیدا کی جائے کہ قانونی پابندیاں بھی اپنی جگہ پر قائم رہیں اور افراد کے حقوق بھی پامال نہ ہوں۔ اس کا حل قرآن نے بتایا۔ اس نے اس ضمن میں، پہلے یہ واضح کر دیا کہ۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ... (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے کتاب اور حکمت اور نبوت بھی کیوں نہ ملی ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ وہ اس کے محکوم اور تابع فرمان ہو جائیں۔

قرآن کے اس اعلان عظیم نے انسانی آزادی کا ایسا منشور عطا کر دیا جس کا تصور بھی ذہن انسانی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو رہی کامل آزادی کی شکل اب قانونی پابندی کو دیکھئے۔ اس کے لئے اسی آیت میں پہلے مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کہہ کر یہ بات سمجھائی گئی کہ افراد کی آزادی پر پابندیاں لگانا تو ضروری ہیں لیکن یہ پابندیاں کوئی انسان نہیں لگا سکتا۔ اس کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ خدا کی طرف سے یہ پابندیاں کس طرح لگائی جائیں گی؟ کیا یہ وہی تھیا کریسی ہوگی جس میں مذہبی پیشوائیت، خدا کے نام کی آڑ میں، ہر قسم کی من مانی کرتی ہے؟ قرآن نے کہا کہ بالکل نہیں۔ تھیا کریسی تو استبداد کی

بدترین شکل ہے، اسی لیے اس نے فرعون کے ساتھ ہامان کو بھی برابر کا مجرم قرار دیا ہے جو مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ تھا۔ قانونی پابندیوں کے لیے اس نے کہا کہ:

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3:79)

خدا نے ان حدود اور پابندیوں کو، جو انسانی آزادی پر عائد کی جائیں گی، اپنی کتاب میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں ہوگا کہ ان پابندیوں میں کسی قسم کی کمی بیشی کر سکے یا ان کے علاوہ کوئی اور پابندی عائد کرے۔ لآ اِلٰہَ اِلاّ اللہ کا عملی مفہوم ہی یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو یہ اقتدار اور اختیار نہیں کہ وہ کسی کو اپنا محکوم اور تابع فرمان (چہ جائیکہ غلام) بنا سکے۔ اب رہا یہ کہ کتاب اللہ میں بیان کردہ حدود اور پابندیوں کی عملی تشکیل اور تنفیذ کی صورت کس طرح متعین کی جائے۔ تو اس کے لیے واضح طور پر بتا دیا گیا کہ یہ حق بھی کسی خاص گروہ اور جماعت کو نہیں دیا گیا، بلکہ یہ تمام افراد معاشرہ کا اجتماعی فریضہ ہے۔ یہ امور ان کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۔۔۔(42:38) یہ حق مشاورت بھی، بنیادی حقوق کی فہرست میں داخل ہے، جس میں مرد اور عورت، امیر اور غریب، سب شریک ہیں۔ اس مشاورت کی عملی مشینری، اپنے اپنے حالات کے مطابق، خود مرتب کی جا سکتی ہے۔

لہٰذا، قرآن نے، یا تو وہ قوانین دے دیئے ہیں جن کی پابندی کی جائے گی اور یا وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے افراد معاشرہ، باہمی مشاورت سے وقتاً فوقتاً قوانین مرتب کر سکیں گے۔ ان حدود سے تجاوز کرنے، یا ان کے علاوہ، اور حدود و قیود متعین کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ یہ انسانی آزادی کو سلب کر لینے کے مترادف ہوگا جس کی اجازت کسی انسان کو نہیں دی جا سکتی۔ اسے وہ شرک قرار دیتا ہے۔ سورہ شوریٰ میں ہے۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۔۔۔(42:21) کیا ان کے کوئی اور شریک ہیں جو ان کے لیے دین خداوندی میں ایسے قوانین بناتے ہیں جن کی اجازت خدا نے نہیں دی؟ لہٰذا، انسانی معاشرہ کے لیے کوئی ایسا قانون مرتب نہیں کیا جا سکتا جس کی اجازت قرآن کریم نے نہ دی ہو۔

یہ ہے وہ طریق جس سے، قرآن کریم، انسانی آزادی پر بھی کوئی حرف نہیں آنے دیتا، اور معاشرہ میں لاقانونیت بھی نہیں پھیلنے پاتی۔ یہ قرآن کے منشورِ حقوقِ انسانیت کی منفرد خصوصیت ہے۔

5۔ حقِ محنت:

قرآن کا ارشاد ہے کہ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ ۔۔۔(39/70) ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملے گا۔ کوئی کسی کی محنت کے ماحصل کو نہ غصب کر سکے گا، نہ اس میں کمی، اسی سلسلہ میں اس نے، دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ:

لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۔۔۔(53:39)۔ بجز ان لوگوں کے جو کام کرنے سے معذور ہوں (جن کا ذکر آگے چل کر آتا ہے)، کوئی شخص محنت اور کوشش کے بغیر، کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔ یعنی اس معاشرہ میں، ایسے خون آشام

طبقہ (Parasites) کے لیے قطعاً گنجائش نہیں ہوگی جو دوسروں کی محنت پر تن آسانی اور عیش پرستی کی زندگی بسر کریں اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی کسی کی محنت کو سلب (Exploit) نہیں کر سکے گا، تو ہر کام کرنے والا، اپنی محنت کے پورے ماحصل کا حقدار ہوگا۔ اس اصول کی رو سے نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کٹ جاتی ہے جس کا وجود ہی دوسروں کی محنت کے ماحصل کو غصب کرنے پر ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! جو کام کرنے کے قابل ہونے کے باوجود دوسروں کی محنت کے ماحصل پر زندگی بسر کرتا ہے، وہ گداگر ہے، خواہ کتنا ہی بڑا دولت مند کیوں نہ ہو۔

6۔ عدل واحسان:

اس کا نام عدل ہے۔ یعنی ہر شخص کو اس کا حق مل جانا۔ قرآن کی رو سے عدل ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جس میں ہر قسم کے حقوق کا تحفظ شامل ہے۔ جسے قانونی عدل کہتے ہیں، اس سے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اگر کسی کا کوئی حق غصب ہوتا ہو، تو عدالت کی مشینری اسے وہ حق دلا دے۔ عدل کے معاملہ میں، قرآن اتنا محتاط اور جز رس ہے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ دیکھنا! اس باب میں دوست اور دشمن میں تمیز نہ کرنے لگ جانا۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی طرف سے دشمنی کا برتاؤ تمہیں اس پر آمادہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ اِعْدِلُوْا ۟ف۔ وہ کچھ بھی کریں، تم ان کے ساتھ ہمیشہ عدل کرو۔ اس لیے کہ یہ ادلے بدلے کی بات نہیں، یہ انسان ہونے کی حیثیت سے ان کا حق، اور اس کی ادائیگی تمہارا فریضہ ہے۔ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ز ۔۔۔(5/8)

> خیرات سے جس طرح شرف انسانیت پامال ہوتا ہے، اور خیرات لینے والے کی عزت نفس جس طرح مجروح ہوتی ہے، وہ ظاہر ہے۔ اس لیے قرآن نے احسان، کو خیرات نہیں قرار دیا بلکہ کہا ہے کہ جس کی کمی رہ جائے، وہ اس کمی کو پورا کرنے کے اسباب وذرائع بطور حق طلب کر سکتا ہے۔ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝۲۴ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝۲۵ ۔۔۔

قانونی عدل سے مراد ہے۔ خدا کے مقرر کردہ قوانین وحدود کے مطابق، نزاعی امور کا فیصلہ کرنا جب قرآن کریم نے حق حکومت کسی انسان کو نہیں دیا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے قانون سازی کا حق کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ) کو نہیں دیا۔ عدل، قوانین خداوندی کی تنفیذ کا نام ہوگا۔ اگر مملکت کا کوئی قانون، قرآنی ضابطہ کے خلاف ہوگا تو مملکت کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اسے بدلوائے اور مملکت کا فریضہ ہوگا کہ اسے تبدیل کرے۔

لیکن، قرآن، عدل تک نہیں رہتا۔ اس سے بھی آگے جاتا ہے (جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے) عدل سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ کسی کا واجب (DUE) ہو، وہ اسے دے دیا جائے لیکن اگر اس سے کسی کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو۔ اس میں کمی رہ جاتی ہو، تو پھر کیا ہو، قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ۔۔۔(16:90) اس صورت میں، تم اس کی کمی کو پورا کر کے، اس کے، اور خود معاشرہ کے توازن کو بگڑنے سے بچا لو۔ اسے احسان کہتے ہیں یہ بھی بنیادی حقوق انسانیت میں شامل

ہے۔ دنیا، ایسے مواقع پر خیرات کی تلقین کرتی ہے، لیکن خیرات سے جس طرح شرف انسانیت پامال ہوتا ہے، اور خیرات لینے والے کی عزت نفس جس طرح مجروح ہوتی ہے، وہ ظاہر ہے۔ اس لیے قرآن نے احسان، کو خیرات نہیں قرار دیا بلکہ کہا ہے کہ جس کی کمی رہ جائے، وہ اس کمی کو پورا کرنے کے اسباب وذرائع بطور حق طلب کرسکتا ہے۔ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾۔۔۔(70:24-25) وہ لوگ، جن کی محنت سے ان کی ضروریات پوری نہ ہوں یا جو محنت کرنے سے معذور ہوں، ان کا، ان لوگوں کے مال میں حق ہے جن کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ ہے اور یہ حق ڈھکا چھپا نہیں قرآنی معاشرہ میں سب کو معلوم ہے۔ افراد کی ہر قسم کی کمی پوری کرنے کو، بنیادی حقوق کی فہرست میں شامل کرنا قرآن کے سوا آپ کو کہیں نظر نہیں آئے گا۔

7۔ رزق کا حق:

انسان (بلکہ ہر ذی حیات) کی زندگی کا مدار، سامان زیست پر ہے۔ دنیا کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ ہر فرد کی اپنی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے سامان زیست خود پیدا یا مہیا کرے لیکن قرآن کریم اس باب میں ساری دنیا سے منفرد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔۔(11:6) دنیا میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق یعنی سامان زیست کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جن ذمہ داریوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، قرآنی نظام میں وہ ذمہ داریاں خود نظام مملکت کی ہوجاتی ہیں لہٰذا، یہ قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ کوئی ذی حیات اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہنے پائے اور وہ تمام افراد معاشرہ سے اعلانیہ کہہ دے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ۔۔۔(6:151)۔ ہم تمہاری ضروریات زندگی پوری کرنے کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات پوری کرنے کے بھی۔ بنیادی ضروریات زندگی کا پورا کرنا، ہر انسان کا بنیادی حق ہے جسے وہ قرآنی نظامِ معاشرہ سے ہر وقت طلب کرسکتا ہے یہ حق آپ کو دنیا کے کسی چارٹر میں نہیں ملے گا۔

اس کی وضاحت میری کتاب نظام ربوبیت میں ملے گی۔

جہاں تک اولاد کے لیے رزق مہیا کرنے کا تعلق ہے اس میں ان کی صحیح تعلیم وتربیت بھی شامل ہے۔ کیونکہ جہاں قرآن نے کہا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ط۔۔۔(6/152)۔ اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کردو تو اس میں ''قتل'' کے معنی جان سے مار ڈالنا ہی نہیں۔ اس سے مراد علم وتربیت سے محروم رکھنا بھی ہے۔ لہٰذا، قرآنی معاشرہ کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام بچوں کی عمدہ تعلیم وتربیت ہو۔ بنابریں، قرآن کی رو سے، سب بچے، عمدہ پرورش اور صحیح تعلیم وتربیت بطور اپنے حق کے طلب کرسکتے ہیں، اور کوئی انہیں اس حق سے محروم نہیں کرسکتا۔

8۔ جان کی حفاظت:

لیکن ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری سے پہلے، انسانی جان کی حفاظت کی ضمانت سامنے آتی ہے۔ قرآن نے اس باب میں واضح طور پر کہہ دیا کہ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط۔۔۔(6:152) خدا نے انسانی جان کو واجب الاحترام قرار دیا ہے اس لیے کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ کسی کو جان سے مار دے۔ ہاں! اگر حق کا تقاضا ہو تو ایسا کیا جاسکتا ہے! حق کے تقاضے کے کیا معنی ہیں، اسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کر دیا کہ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ط۔۔۔ اگر کوئی کسی کو ناحق قتل کر دے، تو اس جرم کی پاداش میں اسے سزائے موت دی جاسکتی ہے یا اگر کوئی شخص معاشرہ کے نظام عدل وامن کو تہس نہس کرنے کی کوشش کرے، اور کسی طرح، اپنی اس تباہ کن روش سے باز نہ آئے تو اسے بھی موت کی سزا دی جاسکتی ہے۔ ایسی صورتوں کے علاوہ، اگر کوئی کسی انسانی جان کو ناحق تلف کر دے تو یوں سمجھو کہ اس نے ایک جان کو تلف نہیں کیا، پوری نوع انسان کو تلف کر دیا ہے اس کے برعکس وَمَنْ اَحْیَاھَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ط۔۔۔(5:32) جس نے کسی ایک انسان کی جان بچائی تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوع انسان کی جان بچالی۔

> اگر کسی کے ہاں چوری ہو جائے یا ڈاکہ پڑ جائے، تو دنیا کے مروجہ نظام عدل کی رو سے مجرم کو سزا دے دی جاتی ہے لیکن جس کا مال چلا گیا تھا، اس کے نقصان کی تلافی نہیں ہوتی۔ اگر یہ نقصان اس کی اپنی غلطی۔ تساہل یا تغافل کی وجہ سے نہیں ہوا، تو اس کی تلافی کا وہ حقدار ہوگا

آپ نے غور فرمایا کہ جن مخصوص حالات میں قرآن کریم نے، کسی انسان کی جان لینے کی اجازت دی ہے۔ (یعنی قانون کی رو سے سزائے موت) وہ بھی درحقیقت عالمگیر انسانی حقوق کی مخالفت کے لیے ہے اسی کو بالحق کہا گیا ہے۔

9۔ مال کی حفاظت:

جان کی حفاظت کے بعد ان چیزوں کی حفاظت بھی بنیادی حقوق میں داخل ہے جو، قانون خداوندی کی رو سے، افراد کے ذاتی تصرف میں رہیں۔ کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ دوسروں کی ان چیزون کو ناجائز طور پر اپنے تصرف میں لے آئے اسی لیے فرمایا کہ لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ۔۔۔(4:29) تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے مت کھاؤ۔ ''مال'' ایک جامع اصطلاح ہے۔ جس میں ہر قسم کی مقبوضات آجاتی ہیں اور اس کا تحفظ ہر شخص کا بنیادی حق ہے۔

یہاں سے ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے اگر کسی کے ہاں چوری ہوجائے یا ڈاکہ پڑ جائے، تو دنیا کے مروجہ نظام عدل کی رو سے مجرم کو سزا دے دی جاتی ہے لیکن جس کا مال چلا گیا تھا، اس کے نقصان کی تلافی نہیں ہوتی۔ اگر یہ نقصان اس کی اپنی غلطی۔ تساہل یا تغافل کی وجہ سے نہیں ہوا، تو اس کی تلافی کا وہ حقدار ہوگا اس اصول کا اطلاق، تا بحد امکان دیگر قسم کے نقصانات پر بھی ہوگا۔

10۔ سکونت کی حفاظت:

جان اور مال کی حفاظت کے بعد، قرآن کریم، ہر فرد کی سکونت کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ اس نے یہودیوں کے خلاف جو فرد جرم مرتب کی ہے اس میں یہ بھی کہا ہے کہ ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَتُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ ۔۔۔ (2:85) تم وہ ہو، جو اپنے لوگوں کو ناحق قتل کر دیتے ہو، اور انہیں ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو۔ لہٰذا، افراد معاشرہ کو سکونت مہیا کرنا مملکت کا فریضہ ہے اور کسی کو بے گھر، بے در، بنا دینا، اس کے اس بنیادی حق کو غصب کر لینا ہے۔

11۔ عصمت کی حفاظت:

عصمت، انسان کی بے بہا متاع ہے یہ وہ بلند ترین قدر ہے جو صرف انسان کا خاصہ ہے حیوانات میں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جنسی اختلاط ایک طبیعی جذبہ ہے جس میں انسان اور حیوان سب شریک ہیں۔ لیکن عصمت کا جذبہ صرف انسانی سطحِ زندگی کا تقاضا ہے لہٰذا قرآن کریم اس حفاظت کو مستقل حق انسانیت قرار دیتا ہے اسی لئے اس نے اس حق کی پامالی کو ایک ایسا جرم قرار دیا ہے۔ جس کی سزا بڑی سخت ہے۔ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيۡ فَاجۡلِدُوۡا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا مِائَةَ جَلۡدَةٍ ۔۔۔ (24:2) زانی مرد ہو یا عورت۔ انہیں سو سو کوڑوں کی سزا دو۔

صرف جرم زنا کا ارتکاب ہی نہیں۔ اس کے نزدیک، شریف عورتوں کے خلاف تہمتِ بے جا بھی سنگین جرم ہے۔ جس کی سزا اسی کوڑے ہے (24:4) اس لیے کہ اس سے بھی ان کی عصمت پر حرف آجاتا ہے۔

اور شریف زادیوں کو چھیڑنا اور تنگ کرنا۔ ان کے خلاف طعن آمیز اور اضطراب انگیز باتیں پھیلا کر لوگوں کے جذبات کو ان کے خلاف مشتعل کرنا، اس کے نزدیک، اس سے بھی بڑا جرم ہے اس جرم کی پاداش میں، اس نے کہا ہے کہ ایسے لوگوں کو شہر بدر کر دیا جائے انہیں حقوق شہریت سے محروم کر دیا جائے۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو ان کے خلاف وارنٹ بلا ضمانت جاری کر کے انہیں گرفتار کیا جائے اور جرم ثابت ہونے پر انہیں قتل کیا جائے اس طرح کہ ان کی پارٹی کا کوئی بھی فرد سزا سے بچنے نہ پائے۔ وَقُتِّلُوۡا تَقۡتِيۡلًا ﴿۶۱﴾ ۔۔۔ (33:61) یہ وہ قانونِ خداوندی ہے جس کے متعلق کہا کہ سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا ﴿۶۲﴾ (33:62) یہی قانون، خدا نے اقوام سابقہ کو بھی دیا تھا اور یہ ایسا محکم قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

ان تمام حقوق کی حفاظت مملکت کا فریضہ ہے۔

12۔ شادی میں انتخاب کا حق:

تعلق زوجین کے سلسلہ میں، قرآن کریم نے اس امر کی صراحت بھی کر دی ہے کہ شادی میں، اپنی مرضی سے انتخاب بھی بنیادی حق ہے۔ اس نے مردوں سے کہا کہ فَانۡكِحُوۡا مَا طَابَ لَكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ ۔۔۔ (4:3) تم اپنی پسند کی عورتوں سے

شادی کرو۔ دوسری طرف یہ کہہ کر عورتوں کے حق انتخاب کی حفاظت کر دی کہ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ط ... (4:19) تم عورتوں کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں فریقین کی رضامندی بنیادی شرط ہے۔

اس سلسلہ میں، ضمناً اتنا اور واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، معاہدہ نکاح کے بعد، خاوند اور بیوی کے حقوق اور ذمہ داریاں یکساں ہوتی ہیں۔۔۔ صرف ایک بات میں مرد کو رعایت دی گئی ہے۔۔۔ اور وہ یہ کہ طلاق (یا بیوگی) کی۔۔۔ صورت میں، عورت کو عدت کی مدت میں نکاح ثانی کی اجازت نہیں ہوتی اور مرد کے لیے کوئی عدت نہیں اور اس کی وجہ ظاہر ہے یعنی اس دوران میں یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ عورت حمل سے تو نہیں یہ حکم، پیدا ہونے والے بچے کے حق کی حفاظت کے لیے ہے۔ یعنی یہ متعین کرنے کے لیے کہ وہ کس کا بیٹا ہے سورہ بقرہ میں ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ط ... (2:228) عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنی ان کی ذمہ داریاں ہیں۔ صرف ایک معاملہ ایسا ہے جس میں مرد کو ایک خصوصی درجہ حاصل ہے اور وہ یہ کہ اسے عدت نہیں گزارنی پڑتی۔

> معاشرہ کا تمدنی معیار اتنا بلند ہونا چاہیے کہ یہ چیزیں تمام افراد معاشرہ کو میسر ہوں۔ جنّتی زندگی میں یہ نہیں کہا گیا کہ ایک خاص طبقہ ان آسائشوں سے بہرہ یاب ہوگا اور دوسرے لوگ ان سے محروم ہوں گے۔ جنّتی زندگی میں جو کچھ کسی ایک فرد کو میسر ہوگا، وہی کچھ دیگر افراد کو میسر ہوگا۔

ان حقوق کا تحفظ مملکت کا فریضہ ہے۔

13۔ حسنِ ذوق کا حق:

قرآن، انسان کے انفرادی حسنِ ذوق (Aesthetic Taste) کا احترام کرتا ہے اور کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اسے، اس حق سے محروم کر دے۔ اس نے بڑی تحدی سے کہا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط ۔۔۔ (7:32) ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے ذوق کی تسکین کے لیے بنایا ہے، اور خوشگوار سامان زیست کو، حرام قرار دے؟ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے، ان سے لطف اندوز اور کیف یاب ہونا، ہر فرد کا بنیادی حق ہے جس سے اسے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ اصولاً یہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا، اسے کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ یہ انسانی آزادی کو سلب کر لینے کے مترادف ہے جس کا حق کسی انسان کو نہیں پہنچتا۔ اسی ضمن میں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کھانے پینے کے انداز اور رہنے سہنے کے طریق پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا بلکہ اس میں ہر ایک کو اس کے ذوق کے مطابق حق انتخاب دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ تم اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کے گھروں میں سے جس کے ہاں جی چاہے کھاؤ پیو، اور خواہ اکٹھے بیٹھ کر کھاؤ یا الگ الگ کھاؤ، اس میں

کچھ مضائقہ نہیں۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا ۔۔۔(24:61) اسی طرح وہ لباس کے معاملہ میں بھی وضع قطع اور تراش خراش پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا اور ہر ایک کے حس ذوق کی رعایت رکھتا ہے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لباس کا مقصد ستر پوشی کے علاوہ، زینت بھی ہے: يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا ۔۔۔(7:26) وہ سونے کے زیورات، چاندی اور شیشے کے برتن، باریک اور دبیز ریشمی ملبوسات، اعلیٰ درجے کے صوفے (76:13-15,18:31) اور اسی قسم کا دیگر سامان آرائش وزیبائش، جنتی زندگی کا خاصہ قرار دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بہ ہیتِ مجموعی معاشرہ کا تمدنی میعار اتنا بلند ہونا چاہیے کہ یہ چیزیں تمام افراد معاشرہ کو میسر ہوں۔ جنّتی زندگی میں یہ نہیں کہا گیا کہ ایک خاص طبقہ ان آسائشوں سے بہرہ یاب ہوگا اور دوسرے لوگ ان سے محروم ہوں گے۔ جنّتی زندگی میں جو کچھ کسی ایک فرد کو میسر ہوگا، وہی کچھ دیگر افراد کو میسر ہوگا۔

14۔ مذہبی آزادی:

مذہب کے معاملہ میں قرآن کریم میں ہر انسان کو پوری پوری آزادی ہے۔ اس کے نزدیک ایمان نام ہے، صداقت کو، عقل وفکر کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت ماننے کا۔۔۔ لہٰذا اس میں جور واکراہ کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۔۔۔(18:29) ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے (اس قرآن میں) آچکا ہے۔ تم اس پر غور وفکر کرو، اور اس کے بعد، جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرلے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ اس نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ خارجی کائنات اور انسان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اس راستے پر چلنے کے لئے مجبور ہے جو اس کے لیے تجویز کیا گیا ہے لیکن انسان کو صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے اسے راستہ دکھا دیا گیا ہے اور اس کے بعد، یہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس راستے کو اختیار کرے یا اس سے انحراف برتے۔ وہ اگر اسے اختیار کرے گا تو اس کی زندگی خوشگواریوں میں گزرے گی۔ اس سے سرتابی برتے گا، تو نقصان اٹھائے گا اگر اسے مجبوراً صحیح راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو اسے بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور پیدا کر دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اسے صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے اب یہ بات منشائے خداوندی کے خلاف ہوگی کہ اسے ایک خاص راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ قرآن میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۔۔۔ اگر تمہارے خدا کے پروگرام میں یہ ہوتا کہ انسان کو ایمان کے راستے پر مجبوراً چلایا جائے۔ تو اس کے لئے ایسا کرنا کیا مشکل تھا، وہ انسانوں کو پیدا ہی ایسے کرتا کہ وہ سب کے سب، آنکھ بند کیے، بھیڑ بکریوں کی طرح، اسی راستے پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے انسان کو ایسا پیدا نہیں کیا۔ اسے اس باب میں اختیار دیا گیا ہے أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٩٩﴾ (10:99) تو کیا تو انہیں مجبور کرے گا کہ وہ بالضرور ایمان لے آئیں۔ یہ تو مشیت خداوندی کے خلاف ہوگا۔ اس لیے تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچائے جا۔ اس سے زیادہ کا تو مکلف نہیں۔ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَدْ تَبَيَّنَ

الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ ۔۔۔(2:256)۔غلط اور صحیح راستہ (اس قرآن کے ذریعے) متمیّز ہوکر سامنے آچکا ہے۔اس کے بعد، دین کے معاملہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام مذہب نہیں (مذہب کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا) اس لیے وہ مذاہب عالم میں سے کسی کو اپنا حریف نہیں قرار دیتا وہ ایک دین، یعنی ضابطہ زندگی یا مملکتی نظام ہے۔وہ اس کی اجازت تو نہیں دے سکتا کہ اس کی حدود مملکت میں رہنے والے کوئی دوسرا نظام مملکت قائم کریں۔ یہ تو ''ریاست درونِ ریاست'' (State with in state) قائم کرنے کے مترادف ہوگا جس کی کہیں بھی اجازت نہیں مل سکتی لیکن وہ اس سے بھی کچھ تعرض نہیں کرتا کہ اس کے حدود مملکت میں رہنے والے اپنے لیے مذہب کون سا پسند کرتے ہیں۔اتنا ہی نہیں کہ وہ ہر ایک کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے۔ وہ جہاں اپنے نظام کے مراکز، یعنی مساجد کی حفاظت کرتا ہے وہاں، تمام اہل مذاہب کی پرستش گاہوں کی بھی حفاظت اپنے ذمے لیتا ہے۔ وہ اسلامی مملکت کے وجود کی ایک وجہ جواز یہ بھی بتاتا ہے کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۔۔۔(22:40) اگر اللہ انسانوں کے ذریعے، سرکش قوتوں کی روک تھام کا انتظام نہ کرتا، تو یقیناً راہبوں کی خانقاہیں۔عیسائیوں کے گرجے۔ دیگر اقوام کی پرستش گاہیں اور مسجدیں جن میں بکثرت خدا کا نام لیا جاتا ہے ڈھا دی جاتیں۔ لہٰذا، ان تمام معبدوں کی حفاظت، قرآنی مملکت کی ذمہ داری ہے، جس کا ہر غیر مسلم، بطور اپنے حق، کے مطالبہ کرسکتا ہے۔

> قرآن، نوعِ انسان کو، مذہبی آزادی کا حق ہی نہیں دیتا۔ بلکہ اس کی بھی ضمانت دیتا ہے کہ کوئی ان کے معبودوں کے خلاف زبان درازی یا ان کی شان میں گستاخی نہ کرے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے جماعت مؤمنین سے تاکیداً کہا ہے کہ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۔۔۔(6:108) تم، غیر مسلموں کے معبودوں کو گالی مت دو۔تم ایسا کرو گے تو وہ، اس کے جواب میں بربنائے جہالت، اللہ کو گالی دے دیں گے۔سو جس طرح تمہیں یہ برا لگے گا، اسی طرح انہیں، ان کے معبودوں کو تمہارا گالی دینا بھی برا لگتا ہے اصل یہ ہے کہ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۔۔۔(6:108) ہر ایک کو اپنا اپنا مسلک اور اپنا اپنا معبود پسند ہوتا ہے۔تم ان تک حق کی بات پہنچاؤ۔ جب یہ بربنائے علم وبصیرت، غلط اور صحیح میں تمیز کرنے کے قابل ہوجائیں گے، تو خود بخود، اپنے معبودان باطل کو چھوڑ کر، صحیح نظام زندگی اختیار کرلیں گے۔تم ان سے مجبوراً ایسا نہیں کرا سکتے۔

لہٰذا، قرآن، نوعِ انسان کو، مذہبی آزادی کا حق ہی نہیں دیتا۔ بلکہ اس کی بھی ضمانت دیتا ہے کہ کوئی ان کے معبودوں کے خلاف زبان درازی یا ان کی شان میں گستاخی نہ کرے۔

اس مقام پر میں، اپنے موضوع سے ذرا سے گریز (Digression) کے لیے معذرت خواہ ہوں۔خدا نے تو مذہب کے معاملہ میں انسان کو اس قدر آزادی عطا کی ہے، لیکن ہمارے ارباب شریعت کا فتویٰ ہے کہ غیر مسلموں کو تو اس کا حق دیا

جاسکتا ہے کہ وہ چاہے اپنے مذہب پر رہیں اور چاہے اسے تبدیل کرلیں۔لیکن ایک مسلمان کو اس کا حق نہیں دیا جاسکتا۔اگر مسلمان مذہب تبدیل کرے گا تو اسے قتل کر دیا جائے گا، بلکہ یہاں تک بھی کہ اگر کسی معاملہ میں اس کے خیالات ان ارباب شریعت سے مختلف ہوں اور اس بنا پر یہ اسے مرتد قرار دے دیں، تو بھی اسے قتل کر دیا جائے گا۔

واضح رہے کہ اس کی تو ہر ایک کو آزادی ہوگی کہ وہ چاہے تو الدین (اسلامی نظام) کے تحت آجائے اور چاہے اس کے باہر (غیر مسلم) رہے۔لیکن اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ بطیب خاطر اسلامی نظام اختیار کرے اور اس کے بعد اس نظام کے احکام میں سے جس حکم کو جی چاہے مانے اور جس سے جی چاہے انکار اور سرتابی اختیار کرے۔اس قسم کی آزادی تو کسی ملک میں بھی مل نہیں سکتی۔اسے مملکت کے تمام قوانین کی اطاعت کرنی ہوگی۔ہاں! اگر وہ کسی وقت اس قسم کی اطاعت کو ناقابل قبول سمجھے، تو اسلام کو چھوڑ کر، کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے۔وہ چاہے تو اسلامی مملکت میں غیر مسلم (ذمی) کی زندگی بسر کرے اور چاہے کسی اور ملک میں چلا جائے۔

اس گریز کے بعد، میں پھر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔قرآن کی رو سے، اگلا بنیادی حق ہے:

15۔ سچی بات کہنے کا حق

قرآن کریم نے افراد کو سچی بات کہنے کا حق ہی عطا نہیں کیا بلکہ اس کا حکم دیا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کی اس نے اسے افراد کی مرضی پر نہیں چھوڑا کہ وہ حق بات کہیں یا نہ کہیں۔اس نے حکم دیا ہے کہ وہ، جہاں بھی ضرورت ہو، حق بات کہنے کے لیے اپنے آپ کو خود پیش کریں۔اب یہ دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کریم کہاں تک جاتا ہے۔اس کا حکم ہے کہ وہ، جہاں بھی ضرورت ہو، حق بات کہنے کے لیے اپنے آپ کو خود پیش کریں۔اب یہ دیکھئے کہ اس بات میں قرآن کریم کہاں تک جاتا ہے۔اس کا حکم ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ ۔۔۔اے جماعت مومنین! تمہارا فریضہ ہے کہ تم عدل وانصاف کو دنیا میں قائم رکھو۔اس کے لیے بنیادی ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ سچی بات بلا رورعایت کی جائے۔اس ضمن میں تم سمجھ لو کہ جب کسی معاملہ کے متعلق کچھ کہنے کا وقت آئے تو یہ نہ خیال کرو کہ تم کسی پارٹی یا فریق کی طرف سے شہادت دینے کے لیے آئے ہو۔تم یہ سمجھو کہ تم صرف اپنے خدا کی طرف سے شاہد بن کر آئے ہو۔شُهَدَآءَ لِلّٰهِ پھر سچی بات کہ دو۔وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ۔۔۔خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔(آپ نے غور فرمایا کہ اس باب میں قرآن، انسان کو کس مقام تک لے جاتا ہے؟) اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ ۔۔۔خواہ وہ تمہارے والدین یا دیگر عزیز رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ جائے۔اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا ۔۔۔جس کے خلاف یہ شہادت جاتی ہے، وہ امیر ہو یا غریب، اس کی پروا مت کرو۔اس لیے کہ فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۟ ۔۔۔اللہ کا حق ان دونوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔یاد رکھو! اپنے مفاد کا تحفظ۔عزیز رشتہ داروں کی محبت اور تعلقات اس پارٹی سے نقصان کا احتمال جو دولت مند ہے، یہ تمام جذبات تمہاری راہ روک کر کھڑے ہوسکتے ہیں۔لیکن فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ ۔۔۔تم ان جذبات کا اتباع قطعاً نہ کرو اور ہمیشہ عدل کے تقاضے کو ملحوظ

رکھو۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ (4:135) نہ ہی تم توڑ مروڑ کر، ذو معنی بات کرو اور نہ ہی اس سے پہلو تہی کرو۔ ایسا کرنے سے ہوسکتا ہے کہ تم دوسرے لوگوں کو دھوکا دے سکو، لیکن تم اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اسے سب کچھ معلوم ہے۔ اس لیے سچی بات کہنے کے لیے دھڑلے سے سامنے آؤ اور، لگی لپٹی بغیر، صاف صاف دوٹوک بات کرو۔

ادھر یہ کہا اور دوسری طرف معاشرہ سے تاکید کی کہ اس کا انتظام کرو کہ شہادت دینے والے کو، کوئی کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائے۔ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ (2:282)۔

16۔ اظہارِ خیال کا حق:

اظہارِ خیال کا حق بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ قرآن کریم نے انسان اور حیوانات میں ایک بنیادی فرق یہ بھی بتایا ہے کہ حیوانات، اپنے مافی الضمیر کے اظہار کی (انسانوں کی طرح) صلاحیت نہیں رکھتے اور انسانوں کو اس کی صلاحیت اور استعداد دی گئی ہے۔ فرمایا: خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾ (55:3-4) خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اسے قوت گویائی (یا اظہارِ خیال کی صلاحیت) عطا کی۔ دوسری جگہ ہے الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ ۔۔۔ (96:4) خدا وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعے بھی اظہارِ خیال کی صلاحیت عطا کی۔ یعنی، زبان یا قلم کے ذریعے اظہارِ خیال کا حق اسے، انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے۔

واضح رہے کہ اظہارِ خیال (یا خدا کی عطا کردہ کسی اور صلاحیت) کا خلاف قانونِ خداوندی، استعمال، جرم قرار پائے گا اور مستوجب سزا۔ لیکن کسی صلاحیت کے خلاف قانونِ خداوندی، استعمال کو جرم قرار دینا، اور بات ہے اور اس حق کو سلب کر لینا، اور بات۔ ان صلاحیتوں کے غلط استعمال کو جرم قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کے حقِ استعمال کو سلب نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا کرنا تو انسان کو حیوان بنا دینے کے مترادف ہوگا۔

17۔ رازوں کی حفاظت کا حق:

قرآن کریم نے اس سے منع کیا ہے کہ کسی کے رازوں کی خوامخواہ ٹوہ لگائی جائے اس کا ارشاد ہے: وَّلَا تَجَسَّسُوْا ۔۔۔ (49:12)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ افراد کو اس کی ضمانت دیتا ہے کہ ان کے راز، افشا نہیں کیے جائیں گے۔ (جرائم کی تحقیق کے سلسلہ میں ایسا کرنا کچھ اور معنی رکھتا ہے) خط و کتابت کی حفاظت کا حق بھی اسی ذیل میں آجاتا ہے اسی طرح وہ، ہر شخص کو پرائیویسی کا حق بھی دیتا ہے جب کہتا ہے کہ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا ۔۔۔ (24:27)۔

18۔ حیثیتِ عرفی کے تحفظ کا حق:

جس چیز کو عام طور پر حیثیتِ عرفی کہا جاتا ہے، قرآن اس کی حفاظت کا بھی حق دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ ۔۔۔ (4:148) اللہ اسے پسند نہیں کرتا کہ کسی کی بری بات کو خوامخواہ اچھالا جائے۔ اس کی اصطلاح مطلوب ہو تو خاموشی سے ایسا کیا جائے ۔۔۔ پھر ارشاد ہے کہ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ ۔۔۔ (49:11) کوئی پارٹی کسی

دوسری پارٹی کا مذاق نہ اڑائے۔ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ط ۔۔۔کسی کے الٹے پلٹے نام نہ رکھے جائیں۔ محض ظن اور گمان کی بنا پر کسی کو مطعون نہ کیا جائے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز ۔۔۔(49:12) اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ جب تک کسی کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہوجائے، اسے مجرم نہ سمجھا جائے، بلکہ کہا یہ جائے کہ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ ⑫ (24:12) هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ ⑯ (24:16) اور یہی نہیں کہ ظن اور قیاس کی بنا پر، کسی کے سامنے اس کی برائی نہ کی جائے، بلکہ اس کی پیٹھ پیچھے بھی ایسا نہ کیا جائے کہ یہ غیبت ہوگی اور غیبت سے قرآن نے سختی سے روکا ہے۔ وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ط ۔۔۔(49:12) اس قسم کے تاکیدی احکامات سے، قرآن، افراد کی حیثیتِ عرفی کا تحفظ کرتا ہے۔

19۔ امن کی ضمانت:

ان تمام حقوق سے آگے بڑھ کر، قرآن کریم یہ ضمانت دیتا ہے کہ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ⑧ (2:38) انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ خوف خارجی خطرات کی طرف سے اندیشہ کا نام ہے۔ لہٰذا، اس معاشرہ میں، ہر فرد، ہر قسم کے بیرونی خطرات سے محفوظ ہوگا اور حزن، اس افسردگی کو کہتے ہیں جو پریشانیوں کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے لہٰذا، جہاں اس معاشرہ کا یہ فریضہ ہوگا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افراد معاشرہ، بیرونی خطرات سے امن میں رہیں، وہاں اس کی یہ ذمہ داری بھی ہوگی کہ وہ ان پریشانیوں کو دور کرے جو لوگوں کے لئے وجہ افسردگی بنتی ہیں۔ خوف اور حزن سے مامونیت، ایسی جامع کیفیت ہے جس میں داخلی اور خارجی، ہر قسم کے اندیشوں اور پریشانیوں سے حفاظت کا تصور آجاتا ہے۔ اسی حفاظت میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ ۔۔۔ (6:164) اس میں کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا یہ نہیں ہوگا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ ذمہ داری کسی کی ہو اور اسے سرانجام کوئی اور دے، کام کسی کا ہو اور مفت میں بے گار کوئی اور بھگتے جرم کسی نے کیا ہو اور دھڑکا کسی اور کو لگا ہوا ہو۔ یہ ہے امن کی وہ ضمانت جس سے ہر شخص کو حقیقی اطمینان حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کا حصول ہر فرد معاشرہ کا بنیادی حق ہے۔

حقوق کا موازنہ:

یہ ہیں، وہ بنیادی حقوق جنہیں قرآن، حقوق انسانیت کی حیثیت سے تسلیم کرتا، اور جن کی ضمانت قرآنی معاشرہ دیتا ہے۔ یہ صرف بڑے بڑے حقوق کی فہرست ہے ورنہ چھوٹے چھوٹے کئی اور حقوق ہیں، جن کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ آپ ان حقوق کو سامنے رکھئے، اور پھر ان کا موازنہ ان حقوق سے کیجئے جن کا ذکر اقوام متحدہ (UNO) کے چارٹر میں کیا گیا ہے آپ پر یہ حقیقت خود بخود واضح ہوجائے گی کہ انسانی فکر، اپنی (اس وقت تک کی) انتہائی بلندیوں کے باوجود، کہاں تک جاسکا ہے اور وحی خداوندی، اس باب میں، انسان کو کہاں لے جاتی ہے۔۔ اور اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ وحی خداوندی (قرآن کریم) نے انسانوں کو یہ حقوق اس زمانے (چھٹی صدی عیسوی) میں عطا کئے تھے جب انسان، اپنے بنیادی حقوق کے تصور تک سے ناآشنا تھا۔

کوئی حق مطلق نہیں:

قرآنی حقوقِ انسانیت کی فہرست کا، اقوام متحدہ کے مرتب کردہ منشور کے ساتھ موازنہ، کے بعد، ایک اور اہم حقیقت پر بھی غور کیجئے۔ جس زمانے میں یو۔ این۔ او کا منشور زیر تحقیق تھا، انجمن اقوام متحدہ کی (Educational Scienticfic and cultural Organization) نے (جسے عام طور پر (Unesco) کہا جاتا ہے، اس موضوع پر ایک سوالنامہ مرتب کیا اور اسے دنیا بھر کے مشہور ارباب فکر ونظر کے پاس بھیجا کہ وہ ان حقوق کے متعلق اپنی آراء کا اظہار کریں۔ (Unesco) نے ان میں سے بلند پایہ مشاہیر کے مقالات کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا جس کا تعارف (Jacques Maritain) نے لکھا تھا۔ ان مقالات میں جس بات کو نمایاں طور پر تسلیم کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے کوئی حقوقِ مطلق (Absolute) ہیں ہی نہیں۔ مسٹر (Maritain) کے الفاظ میں۔

> یہ حقیقت بدیہی ہے کہ تمام حقوق، بالآخر انسانی حقوق ہیں (خدائی حقوق نہیں) اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود وقیود عائد کی جائیں اور انہیں قابل ترمیم وتبدل قرار دیا جائے۔ حتیٰ کہ جن حقوق کو بلا مشروط کہا جاتا ہے، ان میں بھی، ان حقوق کے مالک ہونے میں، اور ان کے استعمال کا حق رکھنے میں بنیادی فرق ہے۔ ملکیت بجا ہے لیکن اس کا استعمال، ان حدود اور پابندیوں کے مطابق ہوگا جو ان پر از روئے عدل عائد کی جائیں گی۔

مشروط حقوق:

لیجیے! ایک ہی تشریح نے، بنیادی حقوق انسانیت کی رفیع الشان عمارت، دھڑام سے نیچے گرادی۔ انسان جس بات کی ضمانت چاہتا ہے۔ اور جس ضمانت سے اسے حقیقی اطمینان حاصل ہوسکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کے کچھ حقوق ایسے ہیں جو اسے محض انسان ہونے کی حیثیت سے بلامشروط حاصل ہیں۔ نہ ان حقوق میں کوئی ردوبدل کرسکتا ہے، نہ من مانی حدود وقیود عائد کرسکتا ہے لیکن جب ایک طرف، اس کے ہاتھ میں حقوق کی فہرست دے دی جائے، اور دوسری طرف اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ ارباب اقتدار (Party in Power) کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ''از روئے عدل'' ان حقوق پر جو پابندیاں چاہے عائد کردے، تو اس سے اسے خاک اطمینان حاصل ہوگا؟ وہ ارباب اقتدار کی دخل اندازی سے بچنے کے لیے ہی تو حقوق چاہتا تھا اگر وہ دخل اندازی بدستور رہے تو اسے اس قسم کے حقوق سے کیا حاصل ہوگا؟ مختلف اقوام عالم کے ہاں، ارباب اقتدار کے ہاتھوں، ان کے حقوق کی جس قدر مٹی پلید ہوتی ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور یہ سب ''عدل وانصاف'' کی خاطر، اور آئین وقانون کے نام سے، کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے اس باب میں، بات بالکل واضح کردی۔ اس نے بیشتر حقوق کو حقوقِ مطلق قرار دیا جن پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی (مثلاً رزق، یعنی بنیادی ضروریات زندگی حاصل ہونے کا حق، احترام انسانیت کا حق، صحیح تعلیم وتربیت کا حق، عدل واحسان کا حق، تحفظِ عصمت کا حق اور اسی قسم کے دیگر حقوق جو یکسر غیر مشروط ہیں (''اور جو حقوق مشروط

ہیں۔'') ان کی شرائط اور حدود کو بھی خود ہی متعین کر دیا اور ان دونوں کو یہ کہہ کر مکمل اور غیر متبدل قرار دے دیا کہ ''وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ ۔۔۔(6:115) تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہوگئی اب ان امور میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں اسی مکمل اور غیر متبدل ضابطہ حیات کا نام قرآن ہے، جو دنیا میں حقوق انسانیت کا واحد ضامن ہے۔

اقوام اس چارٹر پر عمل نہیں کرتیں:

یہ تو رہا ان حقوق کے مشروط اور قابل تغیر وتبدل ہونے کے متعلق جو اقوام متحدہ کے چارٹر میں مذکور ہیں۔ اس کے بعد، اس سے بھی زیادہ اہم بات سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ، ہر چند اس چارٹر کو اقوام عالم کے نمائندوں نے منظور اور تسلیم کیا ہے، لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ قومیں اس پر عمل بھی کریں گی۔ اس ضمن میں، شکاگو یونیورسٹی کا پروفیسر Qincy (wright) اپنے مقالہ میں لکھتا ہے۔

> تجربہ نے بتایا ہے کہ اس باب میں کسی قوم پر بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہر حال میں، حقوق انسانیت کا احترام کرے گی۔ گذشتہ دنوں، اقلیتوں پر جس قدر مظالم کیے گئے ہیں اس سے انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے۔ اگر مجلس اقوام متحدہ فی الواقعہ چاہتی ہے کہ ان حقوق کا احترام ہو تو اسے چاہیے کہ یہ تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لے، اور اقوام عالم کے اقتدار اعلیٰ (Sovereignity) کی روشنی میں اس میں تبدیلی پیدا کرے۔

پروفیسر رائٹ، ان حقوق کے تحفظ کے لئے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اقوام عالم، اس باب میں اپنے اقتدار اعلیٰ کو، اقوام متحدہ کی تحویل میں دیدیں۔ اس کے برعکس ہمیں سیاسی افق پر یہ دکھائی دیتا ہے کہ، مرحوم لیگ اوف نیشنز کی طرح، انجمن اقوام متحدہ کا وجود ہی خطرہ میں ہے۔ کئی اقوام نے انجمن کو اپنے واجبات تک ادا نہیں کیے۔ اس مقام پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب حالات ایسے ہیں تو پھر وہ کون سی صورت ہے جس میں، ان حقوق کے احترام اور تحفظ کا خاطر خواہ انتظام ہوسکتا ہے۔ اس باب میں مسٹر (Maritain) نے اپنے تعارفی مقالہ میں جو کچھ کہا ہے وہ قابل غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

پس چہ باید کرد:

انسانیت کے حقوق کی تعریف (Definition) نہیں، بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لیے، سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے۔ حقوق انسانیت کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو۔ اسی کو ''فلسفہ زندگی'' کہتے ہیں۔

یعنی احترامِ حقوقِ انسانیت کے لیے ضروری ہے کہ تمام اقوام کا فلسفہ زندگی (یا آئیڈیالوجی) مشترک ہو۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا تحفظِ حقوقِ انسانیت کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکے گی۔ قرآن کریم اس کو ایمان کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ تمام نوع انسان کے لیے اقدار (Values) کے یکساں پیمانے مقرر کرتا ہے۔ وہ عالمگیر انسانیت کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاۗءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ

لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (10:57)

اے نوع انسان! تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے، ایک ضابطہ ہدایت آ گیا ہے۔ اس میں ہر اس نفسیاتی کش مکش کا علاج ہے جو انسانوں کے دل کو وقفِ اضطراب رکھتی اور اس طرح ان کے معاشرہ میں فساد پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ جو لوگ اس ضابطہ کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، یہ ان پر کامیابیوں اور خوشگواریوں کی راہیں کشادہ کر دیتا ہے۔

اس ایمان کی بنیاد اس علیٰ وجہ البصیرت یقین پر ہے کہ انسان (یا اقوام) کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانون مکافاتِ عمل کی رو سے متعین ہوتا ہے، اور اسی کے مطابق اقوام کی موت اور حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جو قومیں حقوق انسانیت کا احترام اور تحفظ نہیں کرتیں، وہ تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہیں، اور ان کا عسکری ساز و سامان، اور سیاسی مہرہ بازیاں، انہیں اس تباہی سے بچا نہیں سکتیں۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو نہ کبھی کسی کی خاطر، بدلا ہے، نہ بدلے گا۔ یہی وہ ایمان (یا فلسفہ زندگی) ہے جس سے حقوق انسانیت کا تحفظ ہو سکتا ہے۔۔۔ اسی ایمان کو ایک زندہ حقیقت بنانے اور اسے عملی پیکر میں لانے کے لیے ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا، تاکہ اس آزاد مملکت میں انسانی حقوق کا تحفظ ہو سکے اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ان حقوق کا تحفظ ہے، بلکہ اس کی ہستی کی وجہ جواز ہی یہ ہے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے طلوعِ اسلام نے تحریک پاکستان کی اس شد و مد سے حمایت کی تھی، اور یہی وہ نصب العین جس کی طرف یہ تشکیل پاکستان سے لے کر اس وقت تک مسلسل دعوت دیئے چلا آ رہا ہے۔ یہ مقصدِ عظیم اس وقت حاصل ہوگا جب اس خطۂ زمین میں، قرآنی نظام زندگی قائم ہوگا کہ وہی نظام، احترام آدمیت کا ضامن اور حقوق انسانیت کا محافظ ہو سکتا ہے۔

حرف آخر:

ہم نے اس مقالہ میں صرف حقوق کا ذکر کیا ہے (کہ اس کا موضوع یہی تھا)۔ ذمہ داریوں کا ذکر نہیں کیا۔ حقوقِ مطلق کو چھوڑ کر جس قدر حقوق ہیں وہ مشروط ہوتے ہیں، ذمہ داریوں کے ساتھ۔ بالفاظ صحیح یوں کہیے کہ ہر حق، ایک ذمہ داری کی سرانجام دہی سے ثبت ہوتا ہے۔ اسلامی نظام میں دو گروہ آباد ہوں گے۔ ایک جماعت مومنین جو اس نظام کے قیام و استحکام کی ذمہ دار ہوگی اس کی ذمہ داریاں بڑی اہم اور وسیع ہوں گی ان کا اجمالی سا تصور اس میثاق کی رو سے سامنے آ سکتا ہے جسے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے۔۔۔ یعنی جان اور مال کا فروخت کر دینا۔ ان کے حقوق، ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ دوسرا گروہ غیر مسلموں (اہل الذمہ) کا ہوگا۔ ان کی ذمہ داریاں مملکت کے آئین و قوانین کی رو سے متعین ہوں گی لیکن وہ آئین و قوانین بھی چونکہ ان حدود کے پابند ہوں گے جو خدا کی مقرر کردہ اور غیر متبدل و معلوم ہیں، اس لیے ان غیر مسلموں کو اپنی ذمہ داریوں اور حقوق کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہوگا۔ (جیسا کہ کہا جا چکا ہے) اگر وہ کسی وقت اس نظام کے تابع نہ رہنا چاہیں تو وہ کسی دوسری جگہ جا سکتے ہیں۔ (قرآن کی رو سے) اس نظام کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ان کے مامن تک انہیں بحفاظت پہنچا دیں۔

شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اُسوۂ حسنہ (مسلسل)

بلاشبہ قرآنِ مجید، حیّ و قیوم خدا کی طرف سے نازل شدہ، زندگی کے رہنما اصولوں کی جامع و مانع کتاب ہے لیکن کتاب بہرحال کتاب ہے۔ اس کے اصولوں پر عمل کرنا اور ایسی مخلوق میں رہ کر عمل کرنا جو صاحبِ اختیار و ارادہ ہو، خیر و شر کے دونوں راہوں کے علم کی دعویدار ہو اور ان پر چلنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو، از بس دشوار کام تھا جسے آسان بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتِ بے پایاں سے ایک ایسے انسان کو معبوث فرمایا جس نے عرب کے استحصالی معاشرہ میں رہ کر زندگی کے ہر گوشے میں اپنے اور اپنے رفقائے کار کے لئے صرف حسن کو پسند و اختیار کیا۔ قلب و نظر اور فکر و عمل کو حسین رکھا اور ان کے لئے ہر حال میں حسن ہی کو روا رکھا۔ یہ عظیم، صاحبِ حسن و سرور اور مثالی انسان، رسولِ خدا محمد ﷺ ہیں جن کی زندگی کا ہر پہلو مومنین کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

لَقَدۡ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِہِمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ۚ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (3:164)

قرآنِ کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ تو مانتے ہیں کہ کائنات کو خدا نے بنایا ہے اور اس کا قانون اس میں کارفرما ہے، لیکن اپنی زندگی (یا انسانی معاملات) میں خدا کی رہنمائی (وحی) کو ضروری نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں کو وہ مومن قرار نہیں دیتا۔ اس لئے کہ مومن کے معنی صرف یہی نہیں کہ وہ خدا کی ہستی پر ایمان رکھتا ہو۔

مفہوم: جب کامیابی اور ناکامی، صحیح اور غلط روش، کا دارومدار قانونِ خداوندی پر ٹھہرا جو وحی کے ذریعے ملتا ہے، تو نوعِ انسان کے پاس، اِس قانون کا، اپنی حقیقی شکل میں رہنا نہایت ضروری تھا۔ اس مقصد کے لئے، خدا نے انہی میں سے، ان کی طرف اپنا ایک رسول بھیجا۔ یہ ایمان والوں پر، خدا کا احسان ہے (49:17)، اس لئے کہ وحی کسب و ہنر سے نہیں مل سکتی، خدا کی طرف سے وہبی طور پر مل سکتی تھی۔ وہ رسول، ان کے سامنے، قوانینِ خداوندی پیش کرتا ہے، ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں ان کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوجاتی ہے (92:17، 91:9-10، 9:103)۔ انہیں قانون اور اس کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا ہے یعنی وہ، قوانین خداوندی کی اطاعت اندھا دھند نہیں کراتا، ہر بات کو اچھی طرح سمجھا کر، ذہن نشین کرا کر علی وجہِ

البصیرت اطاعت کراتا ہے۔ اگر خدا کی طرف سے ایسا انتظام نہ ہوتا تو لوگ اسی طرح، حیران وسرگردان، راہ گم کردہ، کھوئے ہوئے پھرتے، جس طرح اس سے پہلے پھرتے تھے۔ رسول ﷺ نے اس نظامِ خداوندی کو عملاً متشکل کر کے دکھایا اور خدا نے اس کے ضابطہ (قرآن) کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا (15:9)۔

بعثتِ رسول ﷺ، مومنین پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔ اس احسان کے عملی پہلوؤں میں سب سے اوّل دعوت ایمان ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں قرآنِ کریم اس بارے میں اسوۂ حسنہ کو کس طرح پیش کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (2:285)

ترجمہ: رسول ایمان لایا اس پر جو اس کے رب کے پاس سے اس پر اُترا اور ایمان والے بھی۔ سب نے مانا اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو یہ کہتے ہوئے کہ ہم اس کے کسی رسول پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے اور عرض کی کہ ''ہم نے سُنا اور مانا''۔ تیری معافی ہو اے رب ہمارے اور تیری طرف ہی پھرتا ہے۔

یہ دعوتِ ایمان ذاتی نمونہ سے رسولِ خدا نے دی اور مومنین کے دل میں اتر گئی۔ بات ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' کی ہے۔ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ کی دعوت کو سن کر اطاعت گزاری اختیار کی۔

اس دعوتِ ایمان کی مزید وضاحت اور دنیا و آخرت کی بھلائی کی بنیاد سورۃ البقرہ میں یوں بیان ہوئی ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ (2:177)

ترجمہ: کچھ اصل نیکی یہ نہیں کہ مونہہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو۔ ہاں اصلی نیکی یہ کہ ایمان لائے اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر۔ اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیر اور سائلوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔ اور صلوٰۃ قائم رکھے اور زکوٰۃ دے۔ اور اپنا قول پورا کرنے والے جب عہد کریں اور بالخصوص صبر والے مصیبت اور سختی میں اور لڑائی کے وقت۔ یہی ہیں جنہوں نے اپنی بات سچی کی اور یہی پرہیزگار ہیں۔

مثبت انداز میں دعوتِ ایمان کا تذکرہ کرنے کے ساتھ، اللہ تعالیٰ نے منفی طریقہ سے بھی ایمان کی وضاحت کی ہے جسے سورۃ النساء میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۳۶

(4:136)

مفہوم: اس نظام کے سلسلہ میں ایک اور اہم و بنیادی حقیقت کو بھی سامنے رکھو۔ اس نظام کے حامل وہ افراد نہیں ہوں گے جو محض مسلمانوں کے گھر پیدا ہوجانے سے سمجھ لیں کہ وہ جماعتِ مومنین کے ممبر ہیں۔ یہ جماعت، آئیڈیالوجی (ایمان) کی بنیادوں پر متشکل ہوتی ہے اور وہی شخص اس کا ممبر ہوسکتا اور رہ سکتا ہے جو اس آئیڈیالوجی کی صداقت پر یقین رکھے لہٰذا اے جماعتِ مومنین! تم ہمیشہ اس نظام کے بنیادی اصولوں کی صداقیت پر یقین رکھو (2:62، 57:28)۔ اور وہ بنیادی اصول ہیں۔ اللہ پر ایمان، اس کے رسول ﷺ پر ایمان، اس کتاب پر ایمان جو اس نے اپنے رسول ﷺ پر نازل کی اور ان تمام کتابوں پر ایمان جو اس نے اس سے پہلے نازل کی تھیں (اور ملائکہ اور حیاتِ اُخروی پر ایمان)۔ جو شخص، اللہ، اس کے ملائکہ، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر، اور حیاتِ اُخروی پر ایمان نہیں رکھتا، ان سے انکار کرتا ہے تو وہ زندگی کے صحیح راستے سے بہت دور جا پڑتا ہے۔

> خدا کی طرف سے عطا کردہ پاکیزہ نظریۂ حیات میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بغیر کسی خارجی سہارے کے خود بخود بلند ہوتا چلا جائے۔ جب انسانی اعمال، اس کے مطابق ہوجاتے ہیں تو اس کی رفتار تیز ہوجاتی ہے۔

(مسلمان کے گھر پیدا ہونے والوں کے متعلق اصولاً تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ ان امور پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ علی وجہِ البصیرت بھی ان امور پر یقین رکھیں)۔

مندرجہ بالا آیات (2:285، 2:177 اور 4:136) سے ظاہر ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور ان کے رفقائے کار مومنین کے نزدیک، ایمان کی بنیادی باتیں پانچ ہیں۔ اللہ پر ایمان، ملائکہ پر ایمان، اس کی کتابوں پر ایمان، اس کے رسولوں پر ایمان اور حیاتِ اُخروی پر ایمان جو لوگ ان پانچ بنائے ایمان کے علاوہ کسی اور چیز کو ایمان کی بنیاد قرار دیتے ہیں، وہ اللہ کے حکم، اسوۂ رسول اور رسولِ خدا ﷺ کے رفقائے کار مومنین کے عمل کے خلاف کرتے ہیں اور یوں ایمان کے معاملہ میں شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ پاک و ہند کے مسلمانوں میں صفتِ ایمان مفصل کے نام سے جو ایمان کے بنیادی امور بتائے جاتے ہیں، ان میں ''وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى'' کا نازیبا اضافہ کردیا گیا ہے۔ اس کا تعلق اللہ کے حکم، اسوۂ رسول ﷺ اور الَّذِيْنَ مَعَهٗ کے عمل سے ہرگز نہیں، یہ عجمی اضافہ ہے اور مومنین کو مشرک بنانے کی سازش۔

اس اضافہ کے علاوہ بھی مسلمانوں میں کئی فقرے محاوراتی طور پر رائج ہیں جو ایمان کو ان پانچ امور کے علاوہ باتوں پر

بھی منحصر سمجھتے ہیں، وہ سب نادرست ہیں۔

قرآنِ کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ تو مانتے ہیں کہ کائنات کو خدا نے بنایا ہے اور اس کا قانون اس میں کارفرما ہے، لیکن اپنی زندگی (یا انسانی معاملات) میں خدا کی رہنمائی (وحی) کو ضروری نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں کو وہ مومن قرار نہیں دیتا۔ اس لئے کہ مومن کے معنی صرف یہی نہیں کہ وہ خدا کی ہستی پر ایمان رکھتا ہو۔ مومن وہ ہے جو وحی پر بھی ایمان رکھے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرے (90-23:84)

سورۃ البقرہ کی آیت نمبر:285 سے ظاہر ہے کہ جو لوگ اسوۂ رسول ﷺ اور الَّذِيْنَ مَعَهٗ مومنین کی طرح ایمان لاتے ہیں وہ تو ہدایت یافتہ ہیں جو اس کے مثل ایمان نہیں لاتے وہ اسی سورۃ البقرہ کی آیت 137 کے مطابق:

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ (2:137)

مفہوم: اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ لوگ صحیح راستے پر ہیں اور اگر یہ اس سے اعراض برتیں تو ان کا یہ اعراض صحیح راستے سے ہٹ جانے کے مرادف ہوگا۔ اگر انہوں نے اس راستے کو اختیار نہ کیا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ تو ان کی مخالفت بدستور رہے گی لیکن آپ ﷺ کو اس کی قطعاً پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔ ہمارے نظام میں اتنی قوت موجود ہے کہ وہ تمہیں ان کی ضرر رسانیوں سے محفوظ رکھ سکے۔ اس لئے کہ یہ اس خدا کا نظام ہے جو سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

یوں اسوۂ رسول ﷺ کے مطابق ایمان لانے سے یہ نور سینوں کے اندر دلوں میں جاگزین ہو جاتا ہے اور اعمالِ صالحہ کی بنیاد بنتا ہے (49:14)۔

ایمان پر مبنی صالحیتِ اعمال:

خدا کی طرف سے عطا کردہ پاکیزہ نظریۂ حیات میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بغیر کسی خارجی سہارے کے خود بخود بلند ہوتا چلا جائے۔ جب انسانی اعمال، اس کے مطابق ہو جاتے ہیں تو اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے انسانوں کو دعوتِ ایمان دی تو اعمالِ صالحہ کی بنیاد فراہم کر کے صدیوں میں ظہور پذیر ہونے والا عروج دار ترقاء چند سالوں میں برپا کر دیا۔ انسانی عماشرہ کی ترقی کی رفتار اس قدر تیز کر دی کہ دنیا آج تک محوِ حیرت ہے کہ محض 23-22 کے قلیل عرصہ میں ایک پس ماندہ قوم کو وہ قوت وغلبہ، عزت وتکریم اور حیاتِ تازہ عطا کر دی کہ وہ اپنی ہم عصر ترقی یافتہ اقوام سے بھی آگے نکل گئی۔ ارشادِ خداوندی ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ

(35:10)

مفہوم: جو قوم، قوت اور غلبہ، عزت و تکریم اور حیاتِ تازہ سے بہرہ اندوز ہونا چاہتی ہے، اسے سمجھ رکھنا چاہئے کہ غلبہ و قوت سب قوانینِ خداوندی کے اتباع سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ نظریۂ زندگی میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بغیر کسی سہارے کے، خود بخود بلند ہوتا چلا جائے (32:5)۔ لیکن اس کی یہ رفتار، انسانی حساب و شمار کی رُو سے، بہت سست ہوتی ہے۔ جب انسانی اعمال اسے سہارا دیتے ہیں تو اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے (14:24)۔

اسوۂ رسولِ ﷺ خدا، یہ ہے کہ ایمان کی دولت دل میں جاگزیں کر کے اعمالِ صالحہ کئے جائیں۔ وہ اعمال جو بنانے والے ہوں (بگاڑ والے نہ ہوں) اور ہر ہر عمل ایسا ہی ہو۔ قرآنِ کریم کی پوری تعلیم اعمالِ صالحہ کی تاکید کرتی ہے لیکن ایمان کے ساتھ ''عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' کا تقید قرآن کریم میں 62 جگہ آیا ہے۔ خصوصاً یہ مقام ملاحظہ فرمائیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ (2:82)

مفہوم: جو قوم خدا کے قانون پر یقین رکھتے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوگی، تو ان لوگوں کو جنتی زندگی نصیب ہوگی۔ اور ان کی کھیتیاں ہمیشہ لہلہاتی رہیں گی (2:112)۔

> وہی اعمالِ صالحہ ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے صالحہ قرار دیا ہے، نہ کہ وہ جنہیں ہم اپنی دانست میں اعمالِ صالحہ سمجھیں۔ ان اعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد کی صلاحتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور نوعِ انسانی کے معاملات سنور جاتے ہیں۔

قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھنا اور اس کے ساتھ ہی صلاحیت بخش کام کرنا، اس سے واضح ہے کہ ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں۔ وہ اعمال جس کا سرچشمہ دل کا یقین نہ ہو محض رسم یا عادت کا نتیجہ ہوتے ہیں جو میکانکی طور پر سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے صحیح نتائج مرتب نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح وہ ایمان جو اعمالِ صالحہ کا محرک نہیں بنتا، دل کا یقین نہیں بلکہ محض زبان کے رسمی اقرار کا نام ہے جو اسی طرح بے نتیجہ ہوتا ہے جس طرح اعمالِ بلا ایمان بے نتیجہ ہوتے ہیں۔

نیز اعمال بھی وہی اعمالِ صالحہ ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے صالحہ قرار دیا ہے، نہ کہ وہ جنہیں ہم اپنی دانست میں اعمالِ صالحہ سمجھیں۔ ان اعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد کی صلاحتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور نوعِ انسانی کے معاملات سنور جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے اعمالِ صالحہ کی کوئی جامع اور مانع فہرست مرتب کر کے نہیں دی۔ اعمالِ صالحہ سے اُسکی مراد تمام ایسے کام ہیں جو مذکورہ خصوصیات کے حامل ہوں۔ یعنی جو کام زمانے کے تقاضوں کے عین مناسب ہوں بشرطیکہ وہ قرآنی اصولوں سے نہ ٹکرائیں۔

اسوۂ حسنہ کے اتباع میں اعمالِ صالحہ کی بنیاد تلاش کی جا سکتی ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا

بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۙ﴿۱۲۰﴾ (9:120)

مفہوم: اہل مدینہ اور اس کے اردگرد بسنے والے بدوؤں کے لئے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ، جہاد کے وقت رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دیتے اور اپنے آپ کو، اس کے مقابلہ میں زیادہ عزیز رکھتے (33:6)۔ (یہ انہوں نے اس لئے کیا کہ وہ راستے کی مشکلات اور مصائب سے ڈرتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ میں) بھوک اور پیاس کی جس مصیبت کو وہ جھیلتے، جو تکان اور مشقت وہ اٹھاتے، ان کا ہر قدم جو اس مقام پر پڑتا، جہاں اس کا پڑنا فریقِ مخالف کے لئے غیض وغضب کا موجب ہوتا، حتیٰ کہ ہر وہ نقصان جو انہیں دشمن کی طرف سے پہنچتا؛ ان میں سے ایک ایک چیز ان کے لئے عملِ صالح بنتی چلی جاتی۔ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات کسی کا حسن کارانہ عمل ضائع نہیں ہونے دیتا۔

وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (9:121)

مفہوم: یاد رکھو! اس نظام کے قیام واستحکام کے لئے جماعتِ مومنین کے افراد جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں۔ خواہ تھوڑا ہو یا بہت۔ یا جو منزل بھی وہ قطع کرتے ہیں، ان سب کے نتائج مرتب ہوتے چلے جاتے ہیں تاکہ خدا کا قانونِ مکافات، انہیں ان کے اعمال کا حسین ترین صلہ دے۔

اعمالِ صالحہ کا مدار ایمان پر ہے۔ جذبات وخواہشات کی اتباع پر نہیں ارشاد ہے:

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ (6:56)

مفہوم: (ان بڑے بڑے لوگوں سے) کہہ دو کہ تم خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہو، مجھے ان کی اطاعت سے روک دیا گیا ہے۔ میں تمہاری خاطر ایسا نہیں کرسکتا۔ تمہارا مطالبہ جذبات پر مبنی ہے اور میری دعوت قانونِ خداوندی پر۔ میں اس قانون کو چھوڑ کر تمہارے جذبات کا اتباع نہیں کرسکتا۔ اگر میں ایسا کروں، تو میں بھی تمہاری طرح راہ گم کردہ ہوجاؤں گا۔ سیدھے راستے پر نہیں رہوں گا۔ آپ فرمادیں، حکم صرف اللہ ہی کا ہے (6:57، 12:40) وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ بطور رسولِ خدا ﷺ میں بھی اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ؕ (50:6، 9:46) صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی گئی ہے (نیز 6:105، 10:109)۔

باقی رہا تمہارا یہ استدلال کہ معاشرتی اقدار ایک دن کی پیداوار نہیں ہوتیں۔ یہ صدیوں کے تجارب کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ آباء واجداد کی روش کے ساتھ الفت اور جذباتی تعلق بھی ہوتا ہے۔ جدید دَور کی علمی تحقیقات یہ بتاتی ہیں کہ معاشرتی نظام کے انداز تاریخی طور پر وجود میں آتے ہیں۔ کوئی نظریہ یا نظام جب رُوبہ عمل ہوتا ہے تو اس کے اندر جو نقائص ہوتے ہیں، حالات کا تقاضا ان میں تبدیلی لاتا ہے۔ ایسی تبدیلیوں کا لوگوں کے نظریات یا ایمان سے تعلق نہیں ہوتا۔ یہ تاریخی وجوب (Historical Necessity) ہوتا ہے اور اسے کسی عمل یا اعمال صالحہ سے روکا نہیں جاسکتا۔

> ماانزل (قرآنِ مجید) کہتا ہے کہ سرمایہ کسی فرد، کمپنی، فرم یا بنک کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتا کہ وہ اسے اپنی مرضی کی اصلی یا جعلی طلب کے مطابق کارندوں کو فراہم کرکے سرمایہ پر اضافہ یا منافع کمائے۔ اور سرمایہ کے زور پر محنت خریدے یا محنت کش کو مجبور کرے۔

یہ استدلال اور ''وجوب'' صریحاً بے اصل ہے۔ بات انسانی رویوں کی ہے۔ قرآنِ کریم وحی کی اتباع پر مبنی ایمان کے تقاضا کے ساتھ اس پر درج ذیل تبصرہ فرماتا اور پھر کشاد کی راہ بتاتا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ (2:170)

مفہوم: ان لوگوں کے پاس اپنے غلط نظام کی سند صرف یہ ہے کہ یہ نظام اُن کے اَسلاف سے متوارث چلا آرہا ہے۔ سوچئے کہ یہ بھی کوئی سند ہے؟ یاد رکھو! غلط اور صحیح، حق اور باطل کی سند اور معیار صرف یہ ہے کہ خدا کی کتاب کا کیا فیصلہ ہے۔ لیکن یہ کبھی اسے معیار تسلیم نہیں کریں گے۔ چنانچہ جب ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ خدا نے (قرآن میں) نازل کیا ہے اُس کا اتباع کرو، تو یہ کہیں گے کہ نہیں! ہم اس کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ یعنی خواہ ان کے اسلاف نہ عقل وبصیرت رکھتے ہوں اور نہ ہی وحی کے راستے پر گامزن ہوں، یہ پھر بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں گے۔

ایک مقام اور دیکھ لیجئے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (5:104)

مفہوم: توہم پرستانہ رسوم کو دین سمجھنے والوں کی حالت یہ ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس قانون کی طرف آؤ جسے خدا نے نازل کیا ہے اور اس کے رسول کی طرف (جو اس کے مطابق ایک عملی نظام متشکل کررہا ہے) تو یہ اس کے جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ نہیں! جو مسلک ہمارے اسلاف سے ہوتا چلا آرہا ہے وہی ہمارے لئے کافی

ہے (2:170)۔ (کس قدر احمقانہ ہے یہ جواب کہ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے اس کے پرکھنے کی قطعاً ''ضرورت نہیں'' ہم اس پر آنکھیں بند کئے چلے جائیں گے، خواہ) ان کے یہ اسلاف نہ علم وبصیرت رکھتے ہوں، نہ ہی خدا کی بتائی ہوئی راہ پر ہوں۔

قرآن کریم نے آباء واجداد کے مسلک یا تاریخی وجوب کی بنا پر ارتقا، یافتہ رویہ پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ اس کی اہمیت ہے کیونکہ معاشرہ ایک دن میں تخلیق نہیں ہوتا۔ گذشتہ سے ملحق چلا آتا ہے لیکن معاشرہ میں رائج قدروں یا نئے تقاضوں کو دو باتوں کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔ پہلے عقلِ انسانی (2:190)/علمِ انسانی (5:104) اور دوسرے ہدایتِ خداوندی۔ اگر یہ روایات واقدار ان دو امور کے تابع ہوں تو انہیں رُو بہ عمل لایا اور رکھا جا سکتا ہے۔ ورنہ انہیں علم وبصیرتِ انسانی اور سب سے اہم خداوندی ہدایت کے تابع لایا جائے۔

عملی مثال سے بات واضح ہو سکے گی۔ ساری دنیا میں سرمایہ سب کاروبار کی بنیاد ہے جس کے پاس سرمایہ نہ ہو (نقد یا وسائل) وہ کوئی کام نہیں کر سکتا، صرف اس کی اپنی محنت ہے جسے وہ سرمایہ کی بدولت یا سرمایہ کار کے منشاء کے مطابق زیرِ عمل لا سکتا ہے۔ سرمایہ کا معاوضہ ہے جو منافع اور اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ ساری دنیا میں یہ سرمایہ کاری نظام قائم ہے۔ انفرادی لوگ، کمپنیاں اور بنک اسی اصول کے مطابق کام کرتے ہیں کہ سرمایہ کا معاوضہ ہوتا ہے۔ اور اس کے بغیر چارۂ کار نہیں۔۔۔ آج کی دنیا کے ماہرین معیشت اپنے سارے علم کی بدولت اس نظریہ اور طریقِ کار کی حمایت کرتے ہیں اور اسے انسانی عقل کا تقاضا تسلیم کرتے ہیں۔۔۔ صدیوں سے یہ نظام آباء واجداد کی روایت کے طور پر چلا آ رہا ہے اور آج کی عقلِ انسانی اور معراجِ علم اسے درست قرار دیتا ہے۔۔۔ کیا ہدایتِ خداوندی یا ما انزل اللہ بھی اس کی تائید کرتا ہے؟۔۔۔ نہیں! ہرگز نہیں!

ما انزل (قرآنِ مجید) کہتا ہے کہ سرمایہ کسی فرد، کمپنی، فرم یا بنک کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتا کہ وہ اسے اپنی مرضی کی اصلی یا جعلی طلب کے مطابق کارندوں کو فراہم کر کے سرمایہ پر اضافہ یا منافع کمائے۔ اور سرمایہ کے زور پر محنت خریدے یا محنت کش کو مجبور کرے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ:

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾ (16:53)

مفہوم: کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ (خارجی کائنات میں) تمہارے لئے زندگی کی جس قدر سہولتیں موجود ہیں اور کسب وہنر کی جس قدر صلاحیتیں تمہیں نصیب ہیں، سب خدا کی عطا کردہ ہیں۔ نہ بنیادی طور پر یہ تمہاری پیدا کردہ ہیں، اور نہ ہی تم انہیں کہیں سے خرید سکتے ہو۔ (قرآن کے معاشی نظام کی اصل وبنیاد ہی اس ایمان پر ہے کہ جو کچھ بھی ہمیں میسر ہے سب خدا کا عطا کردہ ہے؛ اس لئے اسے اُس کے قوانین کے مطابق صرف کرنا چاہئے (16:71)۔ اس کے برعکس نظامِ سرمایہ داری ہے جس میں انسان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جو کچھ مجھے حاصل ہے سب میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے، اس لئے اسے میں جس طرح جی چاہئے صرف میں لاؤں (28:78)۔

چنانچہ جب ان میں سے کوئی سہولت چھنتی ہے اور تمہیں نقصان پہنچتا ہے، تو تمہاری مانگوں کا رخ خدا ہی کی طرف ہوتا ہے اور اسی کے قانون کے مطابق تمہاری مصیبتوں کا ازالہ ہوتا ہے۔

ہر ایک نعمت، سرمایہ اور صلاحیتِ کار خدا کی عطا کردہ ہے اور اسی کی ملکیت ہے لہٰذا اسے منافع یا اضافہ کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿53:39﴾۔ مفہوم: انسان کو وہی نتائج مل سکیں گے جن کے لئے اس نے محنت اور کوشش کی ہوگی۔ جیسی جدوجہد، اسی قسم کے اس کے نتائج۔ خدائی پیمانہ کے مطابق معاوضہ صرف محنت کا ہوگا۔

اسی بنیاد پر قرآن کریم نے اَلرِّبٰو کو حرام قرار دیا ہے:

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ (2:275) (اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربٰو کو حرام)۔ اور یہ کہ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (2:276) اللہ تعالیٰ رِبٰو اکو مٹاتا ہے اور صداقت کو بڑھاتا ہے)۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے سود (الربٰو) کو چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے اور اس کے نہ چھوڑنے کو، خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا (2:278-279)۔

اس مثال سے یہ واضح ہے کہ صدیوں سے مروج آباء واجداد کا طریقہ اور آج کا معاشی علم، اَلرِّبٰوا (سود) کو حلال قرار ہی نہیں دیتا بلکہ ضروری سمجھتا ہے لیکن قرآن کی ہدایت اسے حرام قرار دیتی ہے۔

اس کی دوسری مثال جنسی تعلقات کے حوالہ سے ہم جنسیت (Homo Sexuality) کی ہے جس میں مرد کا مرد سے جنسی تعلق (سدومیّت) اور عورت کا عورت سے جنسی اختلاط (سحاقت) شامل ہے۔ اس کی تاریخ بڑی قدیم ہے اور آباء واجداد سے متوارث چلی آتی ہے۔ خصوصاً صنعتی انقلاب کے بعد کارخانوں میں کام کرنے والے اور والیاں اپنے منکوحہ جوڑوں سے الگ رہتے تھے اس لئے یہ ان میں رواج پڑ گیا۔ ماہرینِ نفسیات اور علم کے دعویداروں کے نزدیک اگر ان حالات میں لوگ اپنی جنسی جذبات کی تسکین کر لیتے ہیں تو ان کے نزدیک کوئی حرج کی بات نہیں۔ مغربی ممالک میں کئی ممالک نے عام حالات میں بھی ہم جنسیت (Homo Sexuality) کی قانونی اجازت دے رکھی ہے۔

یہ مروج آباء واجداد کا طریقہ بھی ہے اور علم اور عقل بھی اس کے قائل ہو چکے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ درست اقدام ہوگا۔ ''عمل صالح'' کہلائے گا؟ قرآنِ کریم نے اسے اپنی ہدایتِ خداوندی کے خلاف قرار دیا ہے (دیکھئے 4:15-16 اور 26:165-166)۔

مندرجہ بالا ہر دو مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اعمال بھی وہی اعمالِ صالحہ ہیں جنہیں قرآنِ کریم (ہدایتِ خداوندی) نے صالح قرار دیا ہے نہ کہ وہ جنہیں ہم اپنی دانست میں اعمالِ صالحہ سمجھیں۔ ان مثالوں سے دوسری بات جو ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلاف سے ملنے والی روایات اور معاشرتی عادات کو عقلِ انسانی/علم وبصیرت کی تائید حاصل ہونی چاہیے۔ اگر ایسی روایات اور علم وبصیرت دونوں کا تقاضہ ایک سا بھی ہو، تو ہر صورت اسے ہدایتِ خداوندی کے تابع رہنا چاہئے۔ دوسری

صورت میں وہ قابلِ قبول نہیں اور اسے اسوۂ حسنہ کی تائید حاصل نہیں ہوگی۔

اصول یہ ٹھہرا کہ روایت تابع دِرایت اور روایت ودرایت دونوں تابع ہدایت (خداوندی)۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی اہمیت ہے لیکن اس اصول کے مطابق معیارِ عمل۔ جیسے مال صدقۂ جان۔ جان صدقۂ آبرو۔ مال کی اہمیت ہے لیکن اگر جان کو خطرہ ہو تو مال قربان کر دینا درست ہوگا اور اگر جان کی موجودگی میں آبرو کو خطر ہو تو جان قربان کر کے آبرو بچا لینا ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح جذبات تابعِ عقل اور عقل تابع وحی۔ اگر اس ترتیب کو برقرار رکھا جائے تو اعمالِ انسانی اعمالِ صالحہ کہلاتے ہیں جنہیں اسوۂ حسنہ کی تائید حاصل ہوتی ہے۔

جو کام زمانے کے تقاضوں کے عین مناسب ہوں بشرطیکہ وہ قرآنی اصولوں سے نہ ٹکرائیں کیا ان کا کرنا بلکہ انہی کا کرنا اعمالِ صالحہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور اسے اسوۂ حسنہ کی تائید حاصل ہے؟ مثلاً غیر مؤمن، اسلامی نظام کے قیام اور بقا میں ایمانی تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ مذاہبِ عالم کے بتائے ہوئے ''اچھے کام'' کرتا اور ان کی تاکید کرتا ہے۔

مثلاً ''راہ'' بنا۔ چاہ بنا۔ سراء بنا۔ یا روٹی، کپڑا اور مکان کی فراہمی کا دعویدار ہے یا پنجابی زبان میں گُلّی، جُلّی اور کُلّی کا عمومی اہتمام کرتا ہے تو کیا یہ اعمالِ صالحہ کہلائیں گے؟ اور انہیں اسوۂ حسنہ کی تائید حاصل ہوگی؟

قرآنِ کریم وضاحت کرتا ہے کہ تقاضائے ایمان کے مطابق اعمالِ صالحہ کی جزاء کیا ہے:

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (46:19)

مفہوم: اس حقیقت کو یاد رکھو کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہوتی اور ہر ایک کے مدارج، اس کے اعمال کے مطابق متعین ہوتے ہیں۔ اس میں نہ کسی سے رعایت برتی جاتی ہے۔ نہ زیادتی کی جاتی ہے۔ یہ ہے خدا کا قانونِ مکافات۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝ (46:20)

مفہوم: ان لوگوں کو (جو ہمارے قانونِ مکافات سے انکار کرتے ہیں) جب تباہی کے جہنم کے سامنے لا کھڑا کر دیا جائے گا تو ان سے کہا جائے گا کہ تم نے صرف دنیا کی طبیعی زندگی کی آسائشوں کو اپنا نصب العین بنایا۔ وہ تمہاری طبیعی موت کے ساتھ ختم ہوگئیں۔ تم ان ہی آسائشوں (مال و دولت) کے بل بوتے پر اکڑتے پھرتے تھے اور چاہتے تھے کہ تم کام تو ایسے نہ کرو جو حق و انصاف کے مطابق ہوں، لیکن بڑائی تمہارے حصے میں آجائے۔ اسی لئے تم نے، ہمارا تجویز کردہ سیدھا راستہ چھوڑ کر اور راہیں اختیار کر لی تھیں۔ سو اس کا نتیجہ یہ رُسوا کن اور ذلت آمیز عذاب ہے جس کے سامنے تم کھڑے ہو۔

قرآنِ کریم کا فیصلہ ہے کہ:

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (4:124)

مفہوم: اس کے برعکس، جو شخص قانونِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھے اور اس کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو۔ وہ مرد ہو یا عورت۔ ایسے لوگ زندگی کی شادابیوں سے بہرہ یاب ہوں گے۔ ان کی محنت کے ماحصل میں ذرّہ برابر کمی نہیں کی جائے گی، ایسا کرنا ظلم ہوگا اور خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

قرآن کریم کی رُو سے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان اپنی زندگی کی تعمیر و اصلاح اس انداز سے کرے کہ وہ حیاتِ اُخروی میں کامیابی سے چل سکے۔ جو لوگ حیاتِ اُخروی کے قائل ہی نہیں، ان کے اعمال کا مقصود حیاتِ دنیا کی طیبات ہوتی ہیں جو انہیں مل جاتی ہیں لیکن آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں ہوتا۔ (دیکھئے 16-11:15)۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا (17:18)

مفہوم: اس سے تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب خدا کا قانونِ مکافات اس قدر محکم گیر ہے، تو پھر وہ قومیں، جو نہ تو مستقل اقدار کو تسلیم کرتی ہیں اور نہ ہی مستقبل کی زندگی پر ایمان رکھتی ہیں، وہ مادی ترقی کس طرح کرتی جاتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ) ہمارا قانون یہ ہے کہ جو کوئی، اس دنیا میں طبیعی مفادِ عاجلہ چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے طبیعی قوانین کے مطابق کوشش کرتا ہے۔ ہم اسے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، جسے ہم نے اپنے اختیار و ارادہ سے ایسا بنایا ہے، مادی مفاد دے دیتے ہیں۔ (جو کسان، ہمارے قوانین طبیعی کے مطابق محنت کر کے فصل بوتا ہے، اسے اس کی محنت کا پھل مل جاتا ہے۔ اس میں کافر و مؤمن کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے بعد) مستقبل کی زندگی میں، اس قوم کے لئے تباہی کا جہنم ہوتا ہے جس میں وہ بدحال اور دُھتکاری ہوئی داخل ہو جاتی ہے (2:220، 16-11:15، 42:20، 46:20)۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (17:19)

مفہوم: اس کے برعکس، جو قوم (مفاد عاجلہ کے ساتھ ساتھ (2:201) مستقبل کی خوشگواریاں بھی چاہتی ہے اور اس کے لئے ایسی کوشش کرتی ہے، جیسا کوشش کرنے کا حق ہے اور مستقل اقدار پر یقین کامل رکھتی ہے تو یہ لوگ ہیں جن کی کوششیں حال اور مستقبل دونوں میں بھرپور نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔

وہ لوگ جن کے سینے دولتِ ایمان سے منور ہیں وہ اپنی زندگی میں اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو رسولِ ﷺ خدا کے اسوۂ حسنہ کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ یہی لوگ درحقیقت اپنی اس دنیا کی زندگی کو خوشگوار بناتے ہیں اور اُخروی زندگی کو کامیاب۔ اور عملِ صالحہ بھی وہی مقبول ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت اور رسول کریم ﷺ کی راہنمائی کے مطابق کیا گیا ہو۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کا قرآنی مفہوم

اللہ تعالیٰ کی صفات کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ خوابیدہ Dormant نہ پڑی رہیں اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اسی لئے تخلیق فرمایا ہے کہ اس کائنات میں اس کی صفات جاری رہیں۔ اس دنیا کا سارا نظام ہی ایسا رکھا گیا ہے کہ بندوں کو خیر وشر کے اکتساب میں مجبور نہ بنایا جائے۔ اگر صرف خیر کے اختیار پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیق عالم کی حکمت و مصلحت پوری نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی ہیں کہ وہ جاری نہ ہوسکتیں۔ ان کے ظہور کا موقع نہ ملتا۔ مثلاً غفور، رحیم، حلیم، منتقم، ذوالبطش الشدید، قائم بالقسط۔ حالانکہ اس عالم کو پیدا کرنے سے مقصد ہی یہ ہے کہ اس کی تمام صفات کا مظاہرہ ہو۔ انسانی تمدنی زندگی میں کسی نظام میں بھی صفاتِ خداوندی پر عمل نہیں ہوسکتا۔ یہ صرف قرآنی نظام ہی ہے جس کی اساس صفاتِ خداوندی پر ہوتی ہے اور صرف اسلامی نظام میں ہر جگہ صفات خداوندی چمکتی نظر آتی ہیں۔ تمام دین کی بنیاد درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفات اور ان کی مقتضیات ہی پر ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں الحمد سے لے کر والناس تک جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے وہ تمام تر صفات الٰہی کے مظاہر وانوار اور ان کے تقاضوں ہی کا بیان ہے۔ انہی سے دین کا فلسفہ وجود پذیر ہوا اور ان ہی سے دین کا مظاہر واشکال بھی ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ یہی صفات خداوندی ہیں جو علیٰ حد بشریت مومن کی ذات کے اندر پیدا ہونی چاہئیں۔ ہر مومن کو رحیم، کریم، رزاق، خبیر، علیم، بشیر ونذیر ہونا چاہئے۔ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ (59:24)، ان صفاتِ خداوندی کو عملی پروگرام میں لانے کے لئے کائنات کی ہر شے سرتوڑ کوشش کر رہی ہے اور اسی لئے سرگرم عمل ہے سرگرداں ہے۔ یہ ہے ''یُسَبِّحُ لَهٗ'' اس آیت میں مادہ لام، لام نافع کہلاتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز ان ہی صفات کو نفع دینے والی بنانے کے لئے سرگرم عمل ہے تم بھی ایسا ہی کرو۔ کائنات کی ہر چیز کو نفع بخش بناؤ۔ یہ ہے قرآنی مفہوم تسبیح پھیرنے کا۔ انسان کی زندگی کا مقصد اپنی ذات میں زیادہ سے زیادہ صفاتِ خداوندی کو پیدا کرنا اور صفاتِ خداوندی کو دوسروں کے فائدہ کے لئے بروئے کار لانا ہے۔

اب اس تمہید کے بعد ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا قرآنی مفہوم بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔

بسم اللہ میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس کے معنی ''میں شروع کرتا ہوں'' ہوں۔ اس میں ''ب'' کے معنی ساتھ کئے جاتے

ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ''ب'' کے معنی ساتھ کے ہوتے ہیں، لیکن ''ب'' سبب بیان کرنے کے لئے بھی آتا ہے سورۂ آل عمران میں ہے فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ (3:11)، پس اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب سے پکڑ لیا۔ لفظ اسم کا ترجمہ نام ہے۔ لیکن قرآنِ کریم نے صفاتِ الٰہی کو اسماء الٰہی بھی کہا ہے سورۂ الحشر میں ارشادِ عالی ہے لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (59:24) خدا کی تمام صفات حسین ترین ہیں۔ اس لئے بسم اللہ میں اسم سے مراد صفاتِ خداوندی ہے۔ حرف ''ب'' اور اسم کے معنی کی وضاحت کے بعد بسم اللہ کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ اس کے بعد کیا جائے گا یا کہا جائے گا اس کا مقصد خدا کی صفت رحمانیت ورحیمیت کا ظہور کرنا ہوگا۔ یعنی یہ صفات محسوس طور پر بروئے کار آجائیں۔ جب ایک مسلمان اپنے کسی کام کی ابتداء ان الفاظ سے کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اس کام کو اس لئے شروع کرا رہا ہوں کہ اس سے خدا کی صفت رحمانیت ورحیمیت ظہور پذیر ہو۔ گویا بسم اللہ کی غایت خدا کی صفت رحمانیت ورحیمیت کو عملاً بروئے کار لانا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم نازل فرمایا تو اس کا مقصد اور انسانی دنیا میں اس کی غرض وغایت بھی یہی ہونی چاہئے۔ میں اپنی بساط کے مطابق اس دنیا میں ان صفات رحمانیت ورحیمیت کو عام کروں۔ میں یہ مضمون تحریر کر رہا ہوں اور آپ اس کا مطالعہ فرما رہے ہیں۔ میرا اس مضمون کو تحریر کرنے اور آپ کا اس کو مطالعہ کرنے کا مقصد یہی ہونا چاہئے کہ رحمتِ حضرت باری تعالیٰ عز اسمہٗ کا ظہور عام ہو جائے۔ ہمارے نزدیک بہر حال یہی مقصد ہے۔

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں، میں اسی لئے نمازی

سانحہ ارتحال

سابقہ بزم طلوع اسلام پشاور کے ایک فعال رکن عظیم اللہ خان صاحب طویل علالت کے بعد وفات پا گئے۔ مرحوم باباجی کے ہفتہ وار درس قرآن میں شرکت کے لئے پشاور سے لاہور جایا کرتے تھے اور جب کبھی لیٹ ہوا کرتے تھے تو باباجی فرمایا کرتے تھے کہ عظیم اللہ خان صاحب پہنچنے والا ہوگا تھوڑا انتظار کرتے ہیں، ایک دو کیسٹس میں باباجی کی یہ گفتگو ریکارڈ بھی ہوئی تھی۔ اس وقت مرحوم کا خیبر بازار میں بک سیلر کا دوکان تھا عظیم سٹیشنرز کے نام سے، اور باباجی کی تمام کتابیں وہاں پر ملا کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں بلند مقام عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عنایت فرمائیں۔ ادارہ لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

نبیلہ حارث، کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

''بچّوں کی تربیت'': کیا واقعی بچّے تو پل ہی جاتے ہیں؟

دوسرا حصّہ: روایتی طریقوں کی جگہ نئے اور مؤثر طریقے، تعلقات اور عملی نمونہ

یہ جان لینے کے بعد کہ وہ کون سے طریقے ہیں جو بچّوں کی تربیت میں منفی نتائج پیدا کرتے ہیں، اب ہم دیکھیں گے کہ کرنا کیا ہے، کہاں سے اِبتداء کریں کہ تبدیلی کا عمل شروع ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ والدین کا کردار کیا ہے؟ بچّوں کی مرضی کے پیچھے چلنا یا اُن کو اپنی مرضی کے پیچھے چلانا؟ یا اِن دونوں باتوں میں توازن رکھنا؟ عام خیال کے برعکس، تینوں میں سے ایک بھی نہیں!

پہلی بات یہ ہے کہ بچّے کو اپنا حصّہ یا اپنی ملکیت سمجھنے کی بجائے انہیں اپنے سے الگ، جیتا جاگتا انسان سمجھنا ضروری ہے، جس کا اپنا انفرادی نفس (Self) ہے۔ والدین کی ذمّہ داری یہ ہے کہ وہ بچّے کی نہ صرف جسمانی اور ذہنی ضروریات بلکہ جذباتی اور نفسیاتی ضروریات بھی ہر مرحلے پر سمجھنے کی کوشش کریں اور ایسے مواقع بہم پہنچائیں جن کے ذریعے اِن تمام صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکے۔ بچّوں کی تربیت اور کردار سازی میں یہ اہم اُصول سمجھ لینا ضروری ہے کہ بچّے جو بھی سیکھتے ہیں، وہ زبانی وعظ و نصیحت کی بجائے آپ کے کردار، شخصیت اور زندگی سے سیکھتے ہیں۔ اِس اُصول کو مدنظر رکھتے ہوئے جو خصوصیات آپ اپنے بچّوں میں دیکھنا چاہتے ہیں، وہ آپ کو اپنے کردار کا حصّہ بنانی ہوں گی۔ بچّوں کو سُدھارنے کی کوششیں کرنے کی بجائے اپنے اندر تبدیلی لانی ہوگی۔ یہ قرآن کا اُصول ہے کہ تبدیلی اندر سے آتی ہے:

> جب آپ ہر مرتبہ، ہر حال میں بچّے کی بے عزتی کرنے سے اجتناب کرتے ہیں اور تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، تو وقت کے ساتھ ساتھ بچّہ یہی قدر اپنانے لگتا ہے۔ یہی وہ ''عملی تعلیم'' اور ''عملی نصیحت'' ہے جو اُنہیں عزّت و احترام کا اصل مفہوم بتاتی ہے۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ يَحۡفَظُوۡنَهٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ ؕ وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوۡمٍ سُوۡٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّالٍ (13:11)

(اُس کے قانون مکافات کی کارفرمائی کے لئے) ہر انسان کے آگے اور پیچھے ایسی قوتیں متعیّن ہیں جو اُس کے ہر عمل کا پیچھا کر کے اُسے اس کے نتیجہ تک پہنچاتی ہیں (82:10-12)۔ اور یوں انسان کا ہر عمل محفوظ ہو جاتا (اور نتیجہ خیز ہو کر رہتا) ہے۔ پھر چونکہ قوم افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہے اس لئے یہی قانون آگے بڑھ کر اقوام کو بھی محیط ہو جاتا ہے۔ اس قانون کا نتیجہ ہے کہ) خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت کو نہ بدلے (چنانچہ جس طرح یہ ایک محکم اصول ہے کہ زندگی کی جو خوشگواریاں کسی قوم کو حاصل ہوں وہ اس سے نہیں چھنتیں جب تک وہ اُن کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ (53:8)۔ اسی طرح) یہ بھی ایک غیر متبدّل قانون ہے کہ جب کسی قوم پر اس کے اعمال کے نتیجہ میں تباہی آتی ہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا اور نہ ہی اُس قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر وہ پھر قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرے تو وہ اس کی مدد کر سکتا ہے۔

ایسا شعوری طور پر کریں یا نہ کریں، آپ جو بھی عملی نمونہ اُن کے سامنے پیش کر رہے ہیں اپنی روزمرّہ زندگی کی شکل میں، وہ اُن کی شخصیت پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ یہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ اُن کو کس طرح کا ماحول دینا ہے۔

جب بچّہ چھوٹا ہوتا ہے تو وہ اپنے ماں باپ کو بہت اُونچے مقام پر رکھتا ہے۔ اُن کو بے عیب سمجھتا ہے، اُن کے علم کو مکمّل سمجھتا ہے، اُن سے مرعوب رہتا ہے اور اُنہی کے جیسا بننا چاہتا ہے۔ لیکن اگر آپ نے اِبتدائی عمر سے ہی بچّے کے ساتھ تعلق مضبوط نہیں کیا اور گفتگو کی عادت نہیں رکھی، بلکہ "ڈسپلن" کرنے پر سارا دھیان دیا، تو دس بارہ سال کی عمر تک پہنچنے تک، یا اُس سے بھی تھوڑا پہلے، بچّہ آپ کو اُس اعلیٰ مقام سے ہٹا دیتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو اب وہ آپ کے جیسا بننا چاہتا ہے اور نہ ہی آپ کی اقدار کو اپنانا چاہتا ہے۔ بلکہ جتنا زیادہ آپ کے تعلقات میں مسائل ہوں گے، یہ ناپسندیدگی اُتنی ہی زیادہ ہو گی۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اِس عمر میں سبھی بچّے ''مشکل'' ہو جاتے ہیں۔ لیکن اِس کی اصل وجہ ماں باپ کے ساتھ تعلقات میں کھچاؤ ہوتا ہے۔ کوئی بھی والدین دانستہ طور پر ایسا نہیں کرتے۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے اُن روایتی طریقوں کا جو ہم بچّوں کی تربیت کے لئے صحیح سمجھ کر عمل میں لاتے ہیں اور جن کا ذکر پہلے حصّے میں آ چکا ہے۔ اب ہم بات کریں گے کہ وہ کون سے نئے طریقے ہیں جو پرانوں کی جگہ لے سکتے ہیں اور اِنتہائی مؤثر ہیں۔

دو بنیادی باتیں ہیں جن پر مضبوط، مؤثر تعلقات اور تربیت کا انحصار ہے۔ ایک یہ کہ بچّے کی خودی (self-worth) کو مجروح ہونے سے بچایا جائے اور یہ اُس صورت میں ممکن ہوتا ہے جب بچّے کو غیر مشروط عزت و احترام اور محبّت دی جائے اور اُس کو ایک انفرادی انسان کی حیثیت سے قبول کیا جائے اور یہ سب والدین کے عمل سے ظاہر ہو کر بچّے کے یقین تک پہنچ جائے۔ دوسری بات یہ کہ بچّوں سے بات چیت کرنے، اُن کو سُننے اور سمجھنے، اور اُن کے ساتھ مل کر آپس کی چھوٹی موٹی چپقلش یا دوسرے مسائل وغیرہ حل کرنے کے مؤثر طریقے سیکھے اور اپنائے جائیں۔

بچّوں کی خودی (self-worth) کی حفاظت

1۔ غیر مشروط عزّت واحترام:

آپ کا چھوٹا بچّہ معمولی سی بات پر دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے اور زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔ آپ غصّے میں چیخ پڑتے ہیں ''بس کر دو! چپ ہو جاؤ!''۔ آپ کا 13 سال کا بچّہ غصے میں کہتا ہے'' آپ سے اچھے تو میرے دوست کے ماں باپ ہیں! آپ تو مجھے کوئی چیز نہیں دِلاتے!'' آپ بُری طرح جھاڑ کر اُسے کمرے میں بھیج دیتے ہیں'' جب بڑوں سے بات کرنے کی تمیز آ جائے تب باہر آنا!''۔ ایسے تمام ''مشکل'' مواقع پر، جب بچّہ اُونچی آواز میں بات کرتا ہے، غلط الفاظ کا چُناؤ کرتا ہے، روتا دھوتا ہے، آپ کو یا کسی اور کو بُرا بھلا کہتا ہے اور ''عزّت'' سے پیش نہیں آتا، یہی وہ نازک مقامات ہیں جہاں بچّوں کو غیر مشروط عزّت دینے کی ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے، آپ کو بُرا محسوس ہو سکتا ہے، آپ کے جذبات بھی مجروح ہو سکتے ہیں لیکن یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کِس طرح کا ردّعمل دیتے ہیں۔ جب آپ ہر مرتبہ، ہر حال میں بچّے کی بے عزتی کرنے سے اجتناب کرتے ہیں اور تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، تو وقت کے ساتھ ساتھ بچّہ یہی قدر اپنانے لگتا ہے۔ یہی وہ ''عملی تعلیم'' اور ''عملی نصیحت'' ہے جو اُنہیں عزّت واحترام کا اصل مفہوم بتاتی ہے۔

2۔ غیر مشروط محبّت وشفقت:

آج آپ بچّے سے ناراض ہیں اور منہ پھلائے گھوم رہی/ رہے ہیں۔ بچّہ پریشان ہے کہ کیا غلطی ہو گئی؟ پوچھتا ہے تو آپ منہ موڑ کر دوسرے بچّے سے بات کرنے لگتی/ لگتے ہیں۔ آخر وہ رونے والا ہو جاتا ہے اور معافی مانگتا ہے تب جا کر آپ اپنی ''محبّت'' بحال کرتی/ کرتے ہیں۔ یہ کسی بھی وقت ''غائب'' ہو جانے والی محبّت بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ یہ آہستہ آہستہ بچّے کو محبّت کا مستحق ہونے کے لئے بے شمار شرائط دے دیتی ہے اور اُس کی زندگی کا مقصد ''آپ'' (یعنی والدین) کو خوش کرنے کی طرف موڑ دیتی ہے۔

اُس سے یہ اِطمینان چھِن جاتا ہے کہ وہ بھی اہم ہے اور محبّت کے قابل ہے۔ اُس کا اپنی اہمیت کے بارے میں تصور کمزور ہو جاتا ہے۔

محبّت تو سبھی والدین اپنی اولاد سے کرتے ہیں لیکن جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا، اس کا محض جذبات کی سطح تک رہ جانا کافی نہیں بلکہ عمل میں ڈھلنا نہایت ضروری ہے۔ دوسرے کا احترام اور اُسے سمجھنے کی کوشش، اُس کی اچھائی کے اِمکان پر بھروسہ، اُس کی بھلائی چاہنا، سب محبت کا لازمی حصّہ ہیں۔ بچّہ جب کوئی غلطی کرے یا غیر مہذّب طریقے سے پیش آئے یا کوئی بھی ایسی حرکت کرے جو آپ کو ناگوار گزرے، تو اُس کو ڈیل کرنے کے طریقوں میں محبّت کم کرنے یا روک دینے کی دھمکی یا عمل ہرگز شامل نہیں ہونا چاہیئے۔

3۔ بچّے کی انفرادی شخصیت کو قبول کرنا:

اِن جملوں پر غور کریں، ''چمچ ٹھیک سے پکڑو، دیکھو گر رہا ہے، کپڑے گندے ہو جائیں گے''، ''لائن کے اندر رنگ بھرو، لاؤ میں دکھاتا/ دکھاتی ہوں کیسے''، ''بلاکس کو مضبوطی سے جوڑو نہیں تو مینار ٹوٹ جائے گا''، ''بادل پیلے رنگ کے کب ہوتے ہیں؟''، ''صاف صاف لکھو''، ''زور سے سلام کرو، آنٹی کو آواز نہیں گئی۔ اِتنا شرماتے کیوں ہو؟''

بچّے روزانہ یہ اور اِن جیسے لاتعداد جملے اپنے ماں باپ سے سنتے ہیں۔ اِن تمام جملوں میں ایک پیغام پوشیدہ ہے جو بچّے کو بتاتا ہے کہ وہ ٹھیک نہیں کر رہا، اُسے ٹھیک ہونے کی ضرورت ہے، وہ کوئی بھی کام خود نہیں کر سکتا، یا درست نہیں کر سکتا جب تک کہ امّی یا ابّو سے مدد نہ لے لے۔ ہم ہر دم بچّوں کو ''بہتر'' بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور کسی اعلیٰ معیار کے مطابق اُنہیں جانچتے رہتے ہیں۔ والدین کی نیک نیّتی اپنی جگہ لیکن بچّوں کو اپنے ہی بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھالنے کی جو بھی کوششیں کرتے ہیں وہ درحقیقت اُن کے لئے نقصان دہ ہیں۔

> جب بچّے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اُس کی بات اچھی طرح سمجھ لی گئی ہے، تو وہ خود ہی مسئلے کا حل نکال لیتا ہے، جذبات کے بادل چھٹ جاتے ہیں تو سوچنے کا عمل خود بخود بہتر ہو جاتا ہے۔ بہت چھوٹے بچّوں سے بات کرتے وقت نیچے بیٹھ جائیں اور نظر ملا کر توجّہ سے بات سنیں۔

یہ بات تحقیق سے ثابت ہے کہ اگر آپ کسی اِنسان میں تبدیلی دیکھنا چاہتے ہیں تو اُس کو پہلے اُسی طرح قبول کریں جیسا وہ ہے۔ اُس کے اندر اچھائی کے اِمکان پر بھروسہ رکھیں اور اُس کو ٹوک ٹوک کر بدلنے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ اِس قبولیت کے احساس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اِنسان کے اندر خود کو بہتر بنانے کی اُمنگ جاگ جاتی ہے اور تب ہی وہ تبدیلی اندر سے آتی ہے جو دیرپا ہوتی ہے۔ بچّوں کے سلسلے میں تو یہ انتہائی ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ وہ تو ابھی سیکھنا شروع کر رہے ہیں۔ وہ اپنے تجربات اکٹھے کر رہے ہیں۔ کیا ہوا اگر چمچ سے کھانا کپڑوں پر گر گیا؟ صاف ہو جائے گا۔ کیا ہوا اگر بلاکس کا مینار ٹوٹ گیا؟ دوبارہ بن جائے گا! اہمیت تو اُن تجربات کی ہے جن سے وہ سیکھتے ہیں اور اُس وقت کی ہے جو وہ آپ کے ساتھ گزارتے ہیں۔

خاموشی بہت قیمتی چیز ہے، خاص کر آج کل کے دور میں۔ اِس کا اِستعمال بڑھا دیجیے۔ بچّے کو اپنی مرضی سے، اپنے طریقے سے اور اپنی رفتار سے کرنے دیجیے جو وہ کر رہا ہے۔ بلاوجہ مدد کرنے، مشورہ دینے یا اعتراض کرنے سے گریز کریں۔ مانا کہ یہ ایک انوکھا تصوّر لگ رہا ہے اور مشکل کام ہے۔ جب ہم بچّے کو دیکھتے ہیں کہ بار بار کوشش کر رہا ہے مگر نا کام ہو رہا ہے، جھنجھلا بھی رہا ہے تو ہم دوڑ کر اُس کا مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں، فطری سی بات ہے۔ لیکن اگر آپ کی نظر مستقبل میں بچّے کی خود اعتمادی اور خود مختاری پر ہے، تو آپ اپنے آپ کو روک لیں گے جب تک کہ بچّہ خود آپ سے مدد نہ مانگے اور تب بھی آپ اُس کی کم سے کم حد تک مدد کریں، جتنی کہ اُس کو اگلے قدم تک لے جائے۔ اُس کو موقع سمجھ کر پوری طرح حاوی نہ ہو جائیں یا

پوری سرگرمی یا کام اپنے ہاتھوں میں نہ لے لیں۔ ظاہر ہے کہ خدانخواستہ کسی خطرے کی صورت میں آپ کو فوری مداخلت کرنی چاہیے۔

بچّوں سے گفتگو، اُن کو سُننے، سمجھنے اور مسائل حل کرنے کے مؤثر طریقے

1۔ سُننا کب اور کیوں ضروری ہے؟

(جب مسئلہ بچّے کا اپنا ہے)

جب بچّہ والدین کے سامنے اپنے کسی خیال، کوئی جذبات یا احساسات کا اظہار کرتا ہے یا اپنے کسی مسئلے کو بیان کرتا ہے، تو وہ عموماً، ڈاکٹر تھامس گورڈن (مشہور ماہرِ نفسیات) کے مطابق، بارہ روایتی طریقوں میں سے کسی ایک طرح جواب دیتے ہیں۔ یہ وہ روایتی طریقے ہیں جو بات چیت کے راستے میں روک بن جاتے ہیں اور والدین کو اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ کب اُن کے اور بچّوں کے درمیان اِتنا فاصلہ بڑھ گیا! مثال کے طور پر بچّے نے کہا" مجھے بھنڈی بالکل نہیں پسند! آپ نے کیوں پکائی؟ میں نہیں کھاؤں گا!" تو جواب میں یہ جملے ملاحظہ فرمائیں:

یہ کیا بات ہوئی؟ سبزیاں کھانا صحت کے لئے بہت فائدہ مند ہوتا ہے!" (نصیحت کرنا، اچھی باتیں بتانا)

میرا بیٹا تو بہت اچھا ہے، امّی کی بات مانتا ہے! شاباش، کھالو جلدی سے (تعریف کرنا)

بہت ہی نخرے باز ہو تم! (نام رکھنا)

کتنے لوگ ہیں جن کو یہ بھی کھانے کو نہیں ملتا! (نصیحتاً شرمندہ کرنا)

بہت مزے کی بنی ہے۔ کھا کر تو دیکھو! (تسلّی دینا)

اِس کے علاوہ اور دوسرے جوابات میں دھمکی دینا، سوالات شروع کر دینا، منطق سے قائل کرنا، تجزیہ کرنا، دھیان دوسری طرف پھیرنے کی کوشش کرنا وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ جب والدین متواتر اِس انداز سے پیش آتے ہیں تو خیالات کی ترسیل کا عمل متاثر ہوتا ہے۔ بچّہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کو سمجھا ہی نہیں گیا اور آہستہ آہستہ وہ اپنی بات کا اِظہار کرنا چھوڑ دیتا ہے اور رشتوں میں تلخی آجاتی ہے۔ سب سے پہلے تو اِن طریقوں کو پہچان لیجئے اور حتیٰ الامکان کوشش کریں کہ چھوڑ دیں۔

مؤثر طریقہ یہ ہے کہ ایسے تمام مواقع پر، جب بچّہ اپنی کوئی بات کر رہا ہے، اپنے خیالات یا جذبات کا اظہار کر رہا ہے تو اُس کی بات میں اپنے کسی بھی خیال، کسی بھی جذبے کی آمیزش نہ کریں اور ساری توجّہ اُس کو سمجھنے پر دیں۔ صرف ہُوں ہاں کریں یا اُسی کی بات کو دہرائیں تاکہ اُس کو پتہ چلے کہ آپ اُس کی بات پورے جذبات و احساسات سمیت سمجھ گئے ہیں۔ اور اُس کو وہیں تک رہنے دیں۔ اِس وقت اُس کو درس دینے، اچھی بات بتانے یا اُس کے خیالات کو "صحیح" رُخ دینے سے مکمّل اجتناب کرنا چاہیئے۔ اکثر اوقات جب بچّے کو یقین ہو جاتا ہے کہ اُس کی بات اچھی طرح سمجھ لی گئی ہے، تو وہ خود ہی مسئلے

کا حل نکال لیتا ہے، جذبات کے بادل چھٹ جاتے ہیں تو سوچنے کا عمل خود بخود بہتر ہو جاتا ہے۔ بہت چھوٹے بچّوں سے بات کرتے وقت نیچے بیٹھ جائیں اور نظر ملا کر توجّہ سے بات سنیں اور یہی طریقہ اپنائیں۔ ہاں لیکن حل تلاش کرنے میں اُنہیں تھوڑی مدد درکار ہو سکتی ہے۔

2۔ بولنا کب اور کیوں ضروری ہے؟

(جب مسئلہ آپ کا ہے)

یہ وہ مقام ہے جس کا قارئین کو بے چینی سے انتظار ہوگا کیونکہ اب والدین کے مسائل اور شکایات کو سُننے کی باری آ گئی ہے!

ایسا ممکن ہی نہیں کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے آپس میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ وقتاً فوقتاً ایسی باتیں ہو سکتی ہیں جو تکلیف کا باعث بنیں۔ یہ تجربات بھی بچّوں کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں کیونکہ اِن کے ذریعے وہ اختلافات اور مسائل کے مثبت طریقے سے حل نکالنا سیکھتے ہیں۔ لہٰذا عام تصوّر کے برعکس، اختلافات کو دبا کر مصنوعی امن کی فضا قائم کرنے کی بجائے اُن کو دور کرنے پر کام کرنا چاہیئے۔ بنیادی بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ برابری کی سطح پر مسائل حل ہو سکتے ہیں اور زور زبردستی کی جہاں ضرورت محسوس ہونے لگے، وہیں رُک کر دوبارہ اپنا محاسبہ اور معاملات کا تجزیہ کریں۔

> ہم والدین اپنی اولاد کو کردار کے جس اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں، وہ حاکمانہ انداز اپنانے سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اِنسان کو اختیار دیا ہے راستہ چُننے کا، یہی اختیار ہمیں اپنے بچّوں کو بھی دینا ہے۔ ہماری ذمّہ داری اِتنی ہی ہے کہ گھر کے اندر اُن کو وہ ماحول فراہم کریں جس میں اُن کی ذات کی صحیح نشوونما ہو سکے، بالکل ایسے ہی جیسے ایک بیج مناسب ماحول میں پودا بن کر اُگتا ہے اور پھلتا پھولتا ہے۔ ہمارا کام اِتنا ہی ہے کہ ہم اُن کے سامنے عملی شکل میں بامقصد زندگی کا نمونہ پیش کریں

آپ دونوں میاں بیوی آپس میں بات کرنا چاہ رہے ہیں اور بچّوں نے شور مچایا ہوا ہے۔ مسئلہ آپ کو درپیش ہے اِس لئے یہ آپ کے بولنے کا وقت ہے اور بچّے کو اب سُننا چاہیئے۔ لیکن طریقہ یہ ہوگا کہ آپ اُس کو صرف اپنا مسئلہ بیان کریں گے۔ ''بیٹا، میں اور امّی آپس میں بات کرنا چاہ رہے ہیں لیکن شور کی وجہ سے بات ہو نہیں پا رہی''۔ یا اپنی ضرورت کا اظہار کریں گے ''میں سکون سے امّی سے بات کرنا چاہ رہا ہوں، شور کی وجہ سے مشکل ہو رہی ہے۔'' بس اِتنا ہی کہہ کر آپ بچّے پر چھوڑ دیں گے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ چونکہ آپ نے بچّوں کو ڈانٹا نہیں، بُرا بھلا نہیں کہا، اور نہ ہی شور مچانے کو غلط کہا، اور صرف اپنی ضرورت یا مشکل بیان کرنے پر مرکوز رہے، بچّے فوراً تعاون کرنے کو تیّار ہو گئے۔ اگر دوبارہ بھی کہنا پڑے تو یہی طریقہ اپنائیں۔ وہ لازمی احساس کریں گے۔

آپ جو بھی اظہار کریں گے، وہ اپنی کیفیت کے حساب سے ہی کریں گے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ نے کچھ بھی میکانیکی طور پر نہیں کرنا۔ اگر کسی وقت شدید غصّہ آ رہا ہے تو اِس بات کا بھی اِظہار کریں کہ مجھے اِس وقت بہت زیادہ غصّہ آ رہا ہے، میں تھوڑی دیر میں بات سُن سکتا/سکتی ہوں۔ والدین کو فوق البشر بننے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ جب بچّے دیکھتے ہیں کہ ماں باپ کے بھی جذبات اور احساسات ہیں، وہ بھی غلطی کرتے ہیں، پھر نادم ہو کر معافی بھی مانگ لیتے ہیں، تو وہ سیکھتے ہیں کہ غصّہ آتا ہے تو کیا کرنا چاہیئے۔ چیزیں پٹخنی چاہئیں یا تھوڑی دیر گہرا سانس لے کر پانی کا گلاس پینا چاہیئے۔ اِسی طرح اختلاف کی صورت میں کمرے میں بند ہو جانا چاہیئے یا بات چیت کے لئے وقت نکالنا چاہیئے۔ یہی سب چیزیں اُن کی تربیت میں مثبت اور تعمیری کردار ادا کرتی ہیں۔ زبانی طور پر آپ کچھ بھی کہتے رہیں، اگر الفاظ اور اعمال کے درمیان فاصلہ ہے تو لفظوں کی وقعت نہیں رہتی۔ اِس فاصلے کو کم کرنے پر ہی توجّہ دینی ہوگی۔

روزمرّہ کے چھوٹے موٹے مسائل اِس انداز سے گفتگو کرنے (یعنی دوسرے کو بُرا بھلا کہنے یا غلط ثابت کرنے کی بجائے اپنی ضرورت یا درپیش مشکل کو بیان کرنے) سے حل کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن بار بار پیش آنے والے یا بڑے مسئلوں کے لئے تھوڑا وقت نکالنا پڑے گا۔ کرنا یہ ہے کہ مسئلہ گھر کے جن افراد سے متعلق ہے، وہ مل کر کوئی ایسا حل تلاش کریں جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو اور کسی پر بھی گراں نہ گزرے۔ یہ یقین کر لیں کہ ایسا بالکل ممکن ہے! ہر فرد کے دماغ میں جو بھی اور جتنے بھی حل آتے ہیں، اُن کو جمع کرتے جائیں اور پھر دیکھیں کہ کون سے قابلِ عمل ہیں اور سب کو منظور ہیں۔ پھر کچھ دن اُن پر عمل کر کے اُن کی افادیت کا اندازہ کریں۔ اگر پھر ضرورت محسوس ہو تو یہی طریقِ کار دوبارہ کر لیں۔ چھوٹی عمر سے ہی بچّوں کو اِس مشق میں شامل کریں جب بھی مسئلہ اُن سے متعلق ہے یا گھر سے متعلق ہے (آخر وہ بھی گھر کے فرد ہیں)۔ جب حل تلاش کرنے میں تمام افراد کی مرضی شامل ہوتی ہے تو اُس پر عمل کروانے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ ہر فرد خود اُس کو اپنا لیتا ہے۔ یہی دلچسپ بات ہے کہ جس گھر کے افراد ایک دوسرے کی بات سمجھنے اور ایک دوسرے کو بات سمجھانے کا ہُنر سیکھ لیتے ہیں، اُس گھر میں مسائل حل کرنا قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ جب وقت گزر چکا ہو تو۔۔۔۔؟

اگر بچّے بڑے ہو چکے ہیں، آپ کے "اختیار" سے باہر ہو چکے ہیں، آپ کے ساتھ تعلّق بس سطحی سا رہ گیا ہے، یا سادہ الفاظ میں، اگر آپ کو لگتا ہے کہ اب بہت دیر ہو چکی ہے، تو میں اِس بارے میں ایک ہی بات کہوں گی۔ پچھتاوا، ندامت، افسوس اپنی جگہ، لیکن جب تک اِس دُنیا کی زندگی ہے، اُمیّد قائم ہے۔ ایسے مقام پر پہنچ کر اُمیّد رکھنی ہے ایک اچھے تعلّق کی، اور اختیار کی خواہش چھوڑ دینی ہے (کیونکہ بہرحال کسی بھی انسان کو، چاہے وہ اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو، اپنے "اختیار" میں رکھنا درست نہیں)۔ اگر حالات یہاں تک پہنچ چُکے ہیں کہ آپس کا رشتہ کمزور ہو گیا ہے تو آپ کو سُننے کا ہُنر بروئے کار لانا ہوگا۔ اگر

آپ اپنی بالغ اولاد کے ساتھ تعلّق بحال یا مضبوط کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی ساری کی ساری توجّہ اُن کو سُننے اور سمجھنے پر صرف کرنا ہوگی۔ جب بھی وہ بات کریں، چاہے کڑوی بات ہو، جذبات کا اِظہار ہو یا آپ کے اعتقادات کے بالکل برعکس بات ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ اُوپر کہا گیا، آپ اُس میں اپنے خیالات کو نہیں مِلائیں گے۔ آپ جواب میں کوئی اعتراض، کوئی مشورہ، کوئی تنبیہہ یا نصیحت نہیں کریں گے، آپ صرف سُنیں گے، جب تک کہ آپ کی اولاد کو اطمینان ہو جائے کہ اُن کی بات سمجھی گئی ہے۔ آپ کا کسی بات سے اِتفاق کرنا ضروری نہیں ہے، لیکن دوسرے کے حساب سے سمجھنا اور محسوس کرنا اہم ہے۔ اِنتہائی صبر کے ساتھ یہ سُننے اور سمجھنے کا عمل جاری رکھیں اور نتائج وقت پر چھوڑ دیں۔ نہ اِس میں کوئی جلدی ہوسکتی ہے اور نہ ہی کوئی مدّت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر پورے دِل سے، نتائج کی پروا کئے بغیر یہ کوشش جاری رکھی جائے، تو یقیناً تبدیلی آئے گی۔ اِس اسٹیج پر آپ بس تعلق مضبوط کر سکتے ہیں۔ تعلق مضبوط ہوتا ہے تب جا کر کوئی آپ کے خیالات اور اعتقادات کو اہمیت دیتا ہے یا اُن کا اثر لیتا ہے۔

بچّوں کی پرورش اور تربیت دُنیا کے اہم ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ اِس کی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالٰی نے عورت کو اکتسابِ رزق کی فکر سے آزاد رکھا ہے اور مرد پر اِس کی ذمّہ داری ڈالی ہے تاکہ ماں (جس کا زیادہ وقت بچّے کے ساتھ گزرتا ہے) پوری توجّہ سے اپنی اولاد کی پرورش اور تربیت کر سکے (اِس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ عورتیں/ مائیں کام نہیں کر سکتیں یا نہیں کرنا چاہیئے۔ بچّے کے ساتھ" کتنا" وقت گزرا سے زیادہ اہم ہے کہ بچّے کے ساتھ ''کیسا'' وقت گزارا)۔ ہم والدین اپنی اولاد کو کردار کے جس اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں، وہ حاکمانہ انداز اپنانے سے ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔ جس طرح اللہ تعالٰی نے اِنسان کو اختیار دیا ہے راستہ چُننے کا، یہی اختیار ہمیں اپنے بچّوں کو بھی دینا ہے۔ ہماری ذمّہ داری اِتنی ہی ہے کہ گھر کے اندر اُن کو وہ ماحول فراہم کریں جس میں اُن کی ذات کی صحیح نشوونما ہو سکے، بالکل ایسے ہی جیسے ایک بیج مناسب ماحول میں پودا بن کر اُگتا ہے اور پھلتا پھولتا ہے۔ ہمارا کام اِتنا ہی ہے کہ ہم اُن کے سامنے عملی شکل میں بامقصد زندگی کا نمونہ پیش کریں اور وہ ہنر استعمال کر کے دکھائیں جن کے ذریعے روزمرّہ کی اُونچ نیچ، نازک معاملات اور اختلافات خوش اسلوبی سے حل کئے جا سکیں۔ اور اُن سے ایسا گہرا تعلق قائم کریں اور بات چیت کا سلسلہ ایسا ہموار رکھیں کہ وہ ہم سے اپنے دِل کی بات بغیر کسی خوف یا پریشانی کے کہہ سکیں۔ جب آپ یہ سب کرتے ہیں تو آپ کے ''اثر'' کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے اور جو اِقدار آپ بچّوں کو سکھانا چاہتے ہیں، وہ با آسانی اُن تک پہنچ جاتی ہیں۔

(بلا معاوضہ مشاورت کے لئے درجِ ذیل نمبر پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ فون: 0333-2121992)

تسوید و تصحیح
محمد ارشد، سلیم اختر

پرویزؒ کا پیغام بچوں کے نام

پرویزؒ صاحب نے کچھ دروس بچوں کے لئے ریکارڈ کرائے تھے۔ پہلے درس کی ٹرانسکرپشن مناسب ایڈیٹنگ کے بعد پیشِ خدمت ہے۔

آج جون 1984ء کی 14 تاریخ ہے اور یہ بچوں کے باباجی پرویزؒ کی آواز ہے۔ میری آواز کو سن کر یہ دیکھیں وہ دوڑا دوڑا ہوا ٹیپو بیٹا آ گیا یہ جان ہے باباجی کی۔ بڑا اچھا بیٹا بڑا فلاسفر ہے اور یہ دیکھیں تیمور نے

> ایسی زندگی جس میں تمام انسانوں کی ہر ایک صلاحیت کی مکمل نشوونما ہو جائے اس کو بچو اسلام کہتے ہیں۔ اسلام کے معنی ہوئے وہ طریقہ جس سے انسان کی تمام کمیاں اور کمزوریاں دور ہو جائیں اور مکمل طور پر نشوونما پالیں اور ہر قسم کے خطرے اور خرابی سے محفوظ رہیں۔ اسی کو اسلامی زندگی کہتے ہیں۔

آنکھ کھولی۔ آپ سمیرا بیٹی، میں، بانو ہیں، کہتی ہیں بادام لیں گی۔ دیکھو میرے بچو آؤ بیٹھ جاؤ۔ تمہارے بابا ہر شام کو تمہیں یہاں بیٹھ کر کہانیاں سناتے ہیں، لطیفے سناتے ہیں، بادام دیتے ہیں، بڑی اچھی طرح سے تم سنتے ہو۔ لیکن آج باباجی تمہیں کچھ اور قسم کی باتیں سنائیں گے۔ تمہیں پتا ہے نہ کہ یہ جمعہ کی صبح کو درس دیتے ہیں قرآن مجید کا لیکن وہاں بڑے بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ بچوں کے لئے وہ نہیں ہوتا۔ آج میں تم بچوں کے لئے کوئی درس دیتا ہوں۔

ابھی شاید اس میں سے تھوڑا کچھ تمہاری سمجھ میں آئے گا جب ذرا اور بڑے ہو جاؤ گے سارا تمہاری سمجھ میں آجایا کرے گا۔ اس وقت تم خود بھی سنو گے اور پھر اپنے دوستوں سے بھی کہو گے یہ ہیں ہمارے باباجی جنہوں نے ہمارے لئے یہ درس ریکارڈ کئے تھے۔ آپ دیکھو آرام سے بیٹھ جاؤ TV بند کر دو شور نہیں مچانا کوئی بات نہیں کرنی، توجہ سے سنتے جاؤ جو ہم کہتے ہیں اور یہ کچھ ریکارڈ بھی ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ہیں درس جو تم بچوں کے لئے ریکارڈ کئے جاتے ہیں۔

چند الفاظ ایسے ہیں جنہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے جب تک تم انہیں اچھی طرح سے نہیں سمجھو گے یاد رکھو سبق یاد نہیں ہوگا۔

بچو باغ میں مالی کو دیکھا ہے۔ کہ وہ بڑی محنت سے زمین تیار کرتا ہے اس میں مناسب کھاد ڈالتا ہے۔

ایک خاص موسم میں اس زمین میں چھوٹے چھوٹے بیج ڈال دیتا ہے پھر پانی دیتا ہے دن بھر سورج کی حرارت گرمی پہنچاتی ہے کچھ دنوں کے بعد اس بیج میں سے ننھی کونپل باہر نکل آتی ہے تم نے دیکھا ہے نہ ہری ہری بڑی نازک سی پتی! مالی اس کی رکھوالی کرتا ہے۔

کبھی اس کو دھوپ میں رکھتا ہے کبھی سایہ کرتا ہے وقت پر پانی دیتا ہے تیز ہواؤں اور سخت سردی سے بچاتا ہے۔ آہستہ آہستہ اسی طرح پودے بنتے ہیں۔ پودا بڑا ہوتا ہے تو اس میں پھول لگتے ہیں۔ چمن لہرا اٹھتا ہے آہا آہا۔ بہت اچھے پھول ہوتے ہیں اگر وہ بیج کسی پھل دار بیل کا ہے تو اس میں پھل لگنے شروع ہوجاتے ہیں پھل آہستہ آہستہ بڑے ہوجاتے ہیں ان میں رنگ خوشبو اور لذت پیدا ہوجاتی ہے پھل پک جاتا ہے اسے ہم اتار لیتے ہیں اور تمہارے ابا جان گھر لاتے ہیں نا کیسے اچھے پھل ہوتے ہیں بڑے مزے کے اچھے اچھے میٹھے میٹھے بڑی اچھی اس میں سے خوشبو آتی ہے۔

وہ اتنا بڑا درخت کہاں سے آ گیا اور اس درخت میں پھول کس طرح سے لگ گئے پھر ان پھولوں کے بعد پھل کیسے پیدا ہو گئے سوچو تو بھلا۔

مالی نے کہاں سے بات شروع کی تھی وہ چھوٹا سا بیج زمین کے اندر رکھا تھا۔ بس یہ سب کچھ اس بیج کے اندر چھپا ہوا تھا۔ بیج کی مناسب پرورش سے اس کی نشوونما ہوئی لفظ ذرا بڑا آ گیا۔ نشوونما کے معنی بڑھنا پھولنا پھلنا اسے کہتے ہیں۔ اس طرح اس کی نشوونما ہوئی اور اس نشوونما سے وہ بیج بڑھتے بڑھتے اتنا بڑا درخت بن گیا اور اس میں ایسے ایسے عمدہ پھل لگ گئے۔

درخت کا تنا اس کی شاخیں اس کے پتے اس کے پھول اس کا پھل سب بیج کے اندر تھا۔

تم کہو گے کہ ہم نے اس بیج کو توڑ کر دیکھا تھا۔ اس کے اندر تو اس میں سے کوئی چیز بھی موجود نہیں تھی۔ یہ ٹھیک ہے اس بیج کے اندر ان میں سے کوئی چیز بھی اس شکل میں نہیں تھی۔ لیکن اس میں یہ سب کچھ بن جانے کی صلاحیت موجود تھی ایک اور بڑا لفظ آ گیا صلاحیت۔ ص۔ ل۔ ا۔ ح۔ ی۔ ت تم کہو صلاحیت اس بیج کے اندر یہ سب کچھ بن جانے کی صلاحیت موجود تھی۔ صلاحیت کے معنی اس کا مطلب ہے کہ وہ سب کچھ بن سکتا تھا۔ اس کے اندر یہ ساری چیز موجود تھی اگر اُس کی مناسب نشوونما کی جائے تو وہ درخت بن سکتا تھا۔ اور درخت میں اس قسم کے پھل بن سکتے تھے۔ سمجھ گئے تم نشوونما کو عربی زبان میں تربیت یا ربوبیت کہتے ہیں یہ لفظ دہرائیں ربوبیت۔ نشوونما کو عربی زبان میں تربیت یا ربوبیت کہتے ہیں جو نشوونما دینے والا ہو اس کو رب کہتے ہیں۔

سمجھ گئے رب کسے کہتے ہیں جو نشوونما دینے والا ہو بیج کو آہستہ آہستہ پھل دار درخت بنا دینا وہی کچھ بنا دینا جو کچھ اس میں بننے کی صلاحیت ہو۔ بیج کی ربوبیت، پہلی بات یہی ہے کہ ربوبیت کسے کہتے ہیں ربوبیت کہتے ہیں

کہ جس کسی میں جو کچھ بننے کی صلاحیت ہو اسے آہستہ آہستہ وہ کچھ بنا دینا۔ بھائی اب آگے چلتے ہیں جس طرح ہر بیج کے اندر ایک خاص قسم کا درخت بننے کی صلاحیت ہوتی ہے اسی طرح ہر انسانی بچہ کے اندر بڑا ہو کر کچھ بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

تم دیکھتے ہو نا کہ قائداعظمؒ بن جانا، ایک پریذیڈنٹ بن جانا ایک وزیر بن جانا ایک بہت بڑا پروفیسر بن جانا، کوئی بڑا عالم بن گیا یہ سارے ایک دن بچے تھے۔

ان میں یہ کچھ بننے کی صلاحیت موجود تھی اگر بچے کی مناسب نشوونما ہو جائے وہ آہستہ آہستہ وہ کچھ بن جاتا ہے جو کچھ بننے کی اس میں صلاحیت ہوتی ہے لیکن اگر اس کی نشوونما نہ ہو سکے ظاہر ہے اس کی تمام صلاحتیں ویسی کی ویسی رہ جاتی ہیں جس طرح اگر بیج کی نشوونما نہ ہو تو وہ بیج ویسا کا ویسا رہ جاتا ہے اس سے درخت نہیں بن سکتا۔

اگر بچے کی تعلیم اچھی نہیں ہوتی اس کی تربیت اچھی نہیں اس کی صحت اچھی نہیں ہوتی اس کی دیکھ بھال نہیں کی جاتی تو اس کی صلاحیتیں ویسی کی ویسی رہ جاتی ہیں پھر وہ کچھ نہیں بنتا۔ جاہل گنوار سا رہ جاتا ہے اگر اس کی مناسب نشوونما ہو جائے تو وہ بہت بڑا آدمی بن جاتا ہے۔

دیکھو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیج کی نشوونما ہو کر اس کی کونپل نکلی لیکن اس کے بعد اس کی پرورش نہ ہوئی اس طرح کیا ہوگا یہ کونپل آگے نہیں بڑھے گی۔

یا بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیج کا درخت بن گیا لیکن اس کے بعد اس کی نشوونما رک گئی تو اس درخت میں پھل نہیں آئے گا اس طرح اگر انسان کی نشوونما کسی خاص درجے پر جا کر رک جائے تو اس کی صلاحیتیں آگے نہیں بڑھ سکتیں یا اگر اس کی صرف کسی ایک صلاحیت کی نشوونما ہو اور باقی صلاحیتیں کی نشوونما نہ ہو تو باقی صلاحیتیں ویسی کی ویسی رہ جائیں گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی پوری پوری ربوبیت نہیں ہوتی۔ دیکھا نہ پھر ربوبیت کا لفظ آیا یعنی نشوونما نہیں ہوتی کیونکہ ربوبیت کا مطلب یہ تھا اس کی تمام صلاحیتوں کی مکمل نشوونما ہو جائے، اسے اسلامی زندگی کہتے ہیں۔ سن لیا تم نے اسلامی زندگی کس کو کہتے ہیں۔ یہ طریقہ جس سے ہر انسان کی تمام صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جائے اسے اسلامی زندگی کہتے ہیں۔ یعنی ایسی زندگی جس میں تمام انسانوں کی ہر ایک صلاحیت کی مکمل نشوونما ہو جائے اس کو بچو اسلام کہتے ہیں۔ اسلام کے معنی ہوئے وہ طریقہ جس سے انسان کی تمام کمیاں اور کمزوریاں دور ہو جائیں اور مکمل طور پر نشوونما پالیں اور ہر قسم کے خطرے اور خرابی سے محفوظ رہیں۔ اسی کو اسلامی زندگی کہتے ہیں۔

لو جی اب آگے بڑھیں۔

تم دیکھتے ہو کہ زمین کو اچھی طرح تیار کر کے اس میں عمدہ بیج ڈال دیا جائے پھر وقت پر پانی دیا جائے اسے سورج کی روشنی اور حرارت ٹھیک ٹھیک پہنچے یعنی نہ کم نہ زیادہ تو اس بیج سے کونپل پھوٹ پڑتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ درخت بن جاتی ہے۔ یعنی بیج کی نشوونما کے لئے مٹی پانی گرمی اور روشنی کی ضرورت ہے لیکن اگر ہم ایسا کریں کہ کسی میز پر ایک جگہ

بیج رکھ دیں دوسری جگہ پر مٹی ڈال دیں اور ایک طرف پانی کی کٹوری رکھ دیں دوسری طرف تھوڑی سی آگ رکھ دیں اور درمیان میں دیا جلا دیں۔ تا کہ اس سے روشنی ہو جائے۔ تم نے دیکھا کس طرح مٹی، پانی، گرمی، روشنی یہ سب موجود ہیں لیکن کیا اس طرح سے بیج سے کونپل پھوٹ آئے گی۔

بتاؤ بچوں کونپل کبھی نہیں پھوٹے گی اور نہ ہی اس کا درخت بنے گا۔

> بیج کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ بیج، مٹی، پانی، گرمی، روشنی سب ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جائیں ایک دوسرے میں گھل مل جائیں اور اس طرح سب مل کر بیج کے اُگنے بڑھنے پھولنے کا ذریعہ بنیں سمجھ لیا تم نے۔ یہ بڑھنے پھولنے کو عربی زبان میں تزکیہ کہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بیج کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ بیج، مٹی، پانی، گرمی، روشنی سب ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جائیں ایک دوسرے میں گھل مل جائیں اور اس طرح سب مل کر بیج کے اُگنے بڑھنے پھولنے کا ذریعہ بنیں سمجھ لیا تم نے۔ یہ بڑھنے پھولنے کو عربی زبان میں تزکیہ کہتے ہیں۔ ت ز ک ی ہ۔ اچھا اب سنیں۔ جس طرح بیج کے اُگنے اور پھولنے پھلنے کے لئے یعنی اس کے تزکیہ کے لئے مختلف چیزوں کا باہمی ملنا ضروری ہے اس طرح انسانی صلاحیتوں کے بڑھنے پھولنے پھلنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ مختلف لوگ مل جل کر ایک دوسرے کی نشوونما کے لئے کوشش کریں۔ سمجھ لیا تم نے مختلف لوگ مل کر ایک دوسرے کی نشوونما کے لئے کوشش کریں اسے کہتے ہیں بچو ربانی بننا۔

دیکھا تم نے رب کے معنی ہیں نشوونما دینے والا ربوبیت کے معنی ہیں نشوونما دینا اس طرح سے جو اکٹھے مل کر نشوونما دیں ایک دوسرے کی پرورش کریں اسے کہتے ہیں ربانی بن جانا یعنی تمام انسانوں کا ایک دوسرے کی نشوونما کرنے کا ذمہ دار بن جانا۔ قرآن کریم میں ہے کہ ہر رسول کا پیغام یہ تھا۔ بچو اب قرآن کریم کی آیات تمہارے سامنے آتی ہیں۔

غور سے سنیے یہ قرآن کریم کی آیات ہیں ہر رسول کا پیغام تھا:

كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (3:79)

اس کے معنی ہیں تم سب ربانی بن جاؤ اس کتاب کے ذریعے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کی تعلیم تمہارے دلوں میں نقش ہو جاتی ہے یہ کتاب کون سی ہے بھلا بتاؤ تو بچو یہ ہے اللہ کی کتاب جسے قرآن کریم کہتے ہیں۔

جس کے تمہیں اب سبق دیے جا رہے ہیں۔

اس لئے بچو اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تم سب ربانی بن جاؤ یعنی ایک دوسرے کی اس طرح مدد کرو کہ کسی کی کوئی ضرورت رکی ہوئی نہ رہے۔ اور ہر اک کی صلاحیتیں پوری پوری نشوونما پالیں۔ سمجھ گئے تم! لو بھئی یہ تھا تمہارا پہلا سبق۔ اب تم جاؤ کل پھر آنا اس وقت اور پھر تمہارا دوسرا سبق شروع ہوگا۔ اچھا بچو کہو السلام علیکم۔ السلام علیکم جیتے رہو بچو!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(گذشتہ سے پیوستہ)

دوقومی نظریہ پاکستان کی اِسلامی مملکت میں اِنسانی ذات کا ارتقاء

باب نمبر:3

حیوان کی احساسی جبلی زندگی سے علم وآزادیِ اِرادہ کی پیکرِ اِنسانی ذات میں ارتقاء

نظریہ ارتقاء خصوصی طور جہاں حیوان سے انسان کا ارتقاء نمودار ہوتا ہے علم نفسیات میں حیوان اور انسان کے فرق کو ''احساس'' کے عنوان سے واضح کیا گیا ہے۔

☆ احساس پر مبنی حیوانی زندگی کی کیفیت کا بیان

عِلمُ النفسیات کی رو سے حیوان میں صرف احساس کی صفت ودیعت کی گئی ہے جبکہ انسان کو اس کے ساتھ شعور اور ارادہ بھی ودیعت کیا گیا ہے۔ احساس ہماری ذہنی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ ہر حس ہمیں خارجی دنیا سے واقف کرنے کے علاوہ خوشگوار یا ناخوشگوار بھی محسوس ہوتی ہے۔ ٹچز کے قول کے مطابق ہم مہیجات کے لئے حس ہی نہیں رکھتے بلکہ اُن کا احساس بھی رکھتے ہیں۔ ہمیں حواس کی بدولت بیرونی اشیاء اور ہمارے اپنے اجسام کے متعلق صِرف واقفیت ہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ صِرف دونوں خوشگواری یا ناخوشگواری کا تجربہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ شعوری زندگی کے ہر لمحہ میں ہم خوش ہوتے ہیں یا ناخوش ہمارا رجحان غیر جانبدارانہ کبھی نہیں ہوتا۔ ونٹ تحسیس کی چھ بڑی اقسام کے درجِ ذیل جوڑے گنواتا ہے۔

1۔ خوشگواری یا ناخوشگواری

2۔ تناؤ اور آسودگی

3۔ جوش اور اضمحلال

اِس کے برعکس احساس ایک مقرون اور مرکب ذہنی عمل ہے جو تحسیس اور وقوف دونوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پس احساس = جس + تحسیس کہلاتا ہے۔ فلسفہ میں احساس کا اصطلاحی مفہوم قدر آفرینی کا داخلی عمل، پسند یا ناپسند کرنا، ترجیح دینا، محسوسات کا ان کے وقوفی یا ارادی پہلو سے قطع نظر داخلی کیفیت جو معروض سے قطع نظر شعور کا رویہ ظاہر کرنے کو کہا جاتا ہے۔

احساس اور حس دونوں ابتدائی ذہنی اعمال ہیں، تاہم اُن میں درجِ ذیل اختلافات پائے جاتے ہیں۔

1۔حواس کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ اِن میں حواسِ خمسہ بصری، سمعی، لمسی، شامہ اور ذائقہ اہم ہیں، لیکن احساسات دو ہی قسم کے خوشگوار یا ناخوشگوار ہوتے ہیں۔

2۔حواس میں کیفیت، شدت، مدت اور وسعت کے جار پہلو پائے جاتے ہیں، لیکن احساس میں چوتھا وسعت کا پہلو نہیں پایا جاتا ہے۔

دو اشیاء کی خوشی یا ناخوشی میں شدت اور مدت کا فرق ہوسکتا ہے، مگر وسعت کا پہلو نہیں ہوتا۔

3۔ایک ہی مہیج ہمیشہ ایک ہی حس پیدا کرتا ہے۔ مگر ایک ہی مہیج سے پیدا شدہ احساس نہ صرف مختلف ہوتا ہے، بلکہ ایک ہی فرد میں بھی مختلف اوقات میں مختلف ہوتا ہے۔ آگ ہمیشہ ایک جیسی حرارت کی حس پیدا کرتی ہے، مگر ہمیشہ ایک جیسا احساس پیدا نہیں کرتی۔ سردیوں مین یہ خوشگوار اور گرمیوں میں ناخوشگوار احساس پیدا کرتی ہے۔

4۔حواس کا ہم باطنی مشاہدہ کرسکتے ہیں، مگر احساسات کا باطنی مشاہدہ نہیں ہوسکتا اور اِسی لئے بیان بھی نہیں ہوسکتا ہے۔

حواس ہمیں خارجی اشیاء کا علم دیتے ہیں، جن کا تعلق کسی شے سے ہوتا ہے، لیکن احساسات کا تعلق ہماری ذات سے ہوتا ہے اور وہ ہمیں ذاتی علم دیتے ہیں۔ حواس کی بدولت ہم جانتے ہیں کہ کوئی شے کیا ہے اور احساسات ہمیں بتاتے ہیں کہ کوئی شے ہم پر کس طرف اثر پذیر ہوئی۔

فلسفہ میں احساس کا اصطلاحی مفہوم قدر آفرینی کا داخلی عمل، پسند یا ناپسند کرنا، ترجیح دینا، محسوسات کا ان کے وقوفی یا ارادی پہلو سے قطع نظر داخلی کیفیت جو معروض سے قطع نظر شعور کا رویہ ظاہر کرنے کو کہا جاتا ہے۔ علم النفسیات کے ماہرین نے احساس کی درج ذیل تین کیفیتوں کی تقسیم سے زیرِ بحث لاکر حیوان سے انسان تک کے ارتقائی عمل کو بیان کرکے ہماری راہنمائی کی ہے۔

1۔نظریہ جبلت کا مؤقف

2۔نظریہ ہیجان کا مؤقف

3۔نظریہ جذبات کا مؤقف

اِن سبھی نظریات کا ترتیب وار بیان کرتے ہوئے آغاز میں ہم پہلے نظریہ جِبلت کو زیرِ بحث لا رہے ہیں۔ ہم یہاں اِن کا ترتیب وار جائزہ لے رہے ہیں۔ پہلے جذبہ جِبلت/ عادت کی تقسیم کی کیفیتوں میں جِبلت اور بعد میں عادت کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

☆ حیوانی نظریہ جِبلت کا مؤقف

جبلت کا لغوی مفہوم لغت میں نفسیات کے حوالے سے ایک خلقی خود کار تحریک جو انسانوں اور حیوانوں میں بنیادی حیاتیاتی ضرورتوں کی تسکین کے لیے ہوتی ہے جو با مقصد اور ہدایتی رویے پر منتج ہوتی ہے۔ ایک غیر اختیاری رجحان یا تحریک

جو خاص حالات میں خاص انداز سے عمل کرتی ہے یعنی کسی چیز کی فطری صلاحیت۔

نفسیات میں جبلت کی تعریف میکڈوگل کے حوالے سے وہ موروثی طبعی نفسی میلان جو مخصوص قسم کے مہیجات سے بیدار ہو کر فرد میں مخصوص قسم کا ہیجانی اشتعال اور اس (ہیجانی اشتعال) کی مناسبت سے خاص قسم کے عمل کا ارتقاب کرنے کی طلب پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح جبلی کردار کسی جبلت کے مشتعل یا بیدار ہونے کے نتیجے میں وجود آنے والا کردار، غیر اکتسابی اور اضطراری کردار ایسا فعل ہے، جو آموزش اور تربیت کا نتیجہ نہ ہو۔

فلسفہ میں جبلت عضویہ کا مخصوص مہیج کی موجودگی میں معروض کا ادراک کرنے، اس سے متاثر ہونے، اس کی جانب یا خلاف عمل کرنے کا خلقی، غیر اکتسابی یا وہبی میلان ہوتا ہے۔

فلسفہ ہی کی شاخ نظریاتی نفسیات کے حکمائے قدیم حیوانوں کی حرکات کو جبلی، لاشعوری اور میکانکی قرار دیتے تھے اور انسانوں کے افعال کو جبلی، شعوری اور ارادی گردانتے تھے۔ اِس کے برعکس جدید علمِ حیاتیات کے ماہرین انسانوں اور حیوانوں کے باہمی جبلی رشتے پر زور دیتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ حیوانوں کی طرح انسانوں کا کردار بھی بڑی حد تک جبلی رجحانات پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ جانوروں کے اندر ایسی قوت ہے، جو بغیر کسی ارادے کے کام کرتی ہے اور خارجی عمل کے ردعمل کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ردعمل بالعموم مستقل نوعیت کا ہوتا ہے اور اس کے بارے میں پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ جبلت کی ان صفات کا انکشاف ہوتا ہے۔

1۔ جبلت موروثی اور پیدائشی ہوتی ہے۔

2۔ یہ اکتساب یا آموزش سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ ورثے میں ملتی ہے۔

3۔ یہ شعور میں نہیں بلکہ لاشعور میں موجود ہوتی ہے اور اشتعال کی حالت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس تعلق کو واضح کرنے کے لیے میکڈوگل تالے اور چابی کی تمثیل پیش کرتا ہے۔

جس طرح ایک تالہ ایک مخصوص چابی سے کھلتا ہے اسی طرح ایک جبلت اپنے مخصوص مہیج سے مشتعل ہوتی ہے۔

4۔ ہر فرد کی زندگی کے لیے ہر جبلت کا ہونا لازمی ہے۔

5۔ جبلت بذات خود بے اختیاری اور میکانکی ہوتی ہے ارادی نہیں ہوتی۔

6۔ ہر جبلت کا کوئی مقصد ہوتا ہے مگر وہ مقصد شعوری ذہن میں نہیں ہوتا۔

نظریہ جبر میں جہاں تک انسان کی طبیعی/ مادی زندگی یعنی حیوانی زندگی کا تعلق ہے، وہاں میکانکی/ جبلی طاقتیں کارفرما ہوتی ہیں اور ان ہی کی اطاعت کرنے کا انسان میں عادت ہو جاتی ہے۔ جبلت اور عادت کو بظاہر مترادف معانی میں لیا جاتا ہے اور وہ ایک ہی قسم کا عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان میں نمایاں اہمیت کا حامل فرق بھی پایا جاتا ہے۔ اِن کو مترادف معانی میں اِس لئے لیا جاتا ہے کہ جبلت اور عادت دونوں ایسے اندرونی میلانات یا رجحانات ہیں جو میکانکی افعال کی شکل میں

ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ دونوں میں افعال کم وبیش ایک ہی انداز میں سرزد ہوتے ہیں اور دونوں میں شعور کی موجودگی غیر اہم ہوتی ہے۔ العادۃ طبیعہ الثانیہ کو طبیعت اوّلیٰ یعنی جبلت پر اضافہ کر کے طبیعت ثانیہ یا عادت کا نام دیا جاتا ہے۔ البتہ جبلت اور عادت میں نمایاں اِمتیاز بھی نظر آتے ہیں کہ

1۔ جبلت میں تبدیلی ممکن نہیں لیکن عادت میں تبدیلی کی قوت موجود ہے۔

2۔ جبلتوں میں آموزش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جانور بغیر سیکھنے کے جنسیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر عادات سیکھنے سے آتی ہیں۔ جو حیوان وانسان حالات کے مطابق جائزہ لے کر سیکھتے ہیں۔

3۔ ایک نوع کے تمام افراد میں کم وبیش ایک جیسی جبلتیں پائی جاتی ہیں۔ مگر عادات مختلف ہوتی ہیں۔

4۔ جبلت کے اعمال میں میلانات کا ہونا ضروری نہیں جبکہ عادت میں میلانات کو قبول کرنا ضروری ہے۔

ہم یہاں دیکھ رہے ہیں کہ جبلت اور عادت، حیوانوں اور انسانوں دونوں میں موجود ہوتی ہیں لیکن نوع میں فرق ہونے کی وجہ سے انسانوں میں حیوانوں سے ایک الگ اور ممتاز مقام رکھتی ہیں۔

☆ عِلمُ النفسیات کے اہم مُفکر میکڈوگل کی اِنسانی جبلتوں کی جماعت بندی کی تشکیل

یہ ثابت کرنا آسان ہے کہ انسان بھی حیوانوں کی طرح جبلتیں رکھتا ہے۔ مگر اس کی جبلتوں کا گنوانا آسان نہیں۔ حکمائے نفسیات انسانی جبلتوں کے متعلق مختلف نظریات پیش کرتے ہیں۔ بعض حکماء جبلتوں کی کم سے کم تعداد کے قائل ہیں اور بعض جبلتوں کی تعداد کو بہت بڑھا دیتے ہیں۔ اِنسانی جبلتوں کی میکڈوگل کی جماعت بندی سند کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کے خیال میں ان کی تعداد چالیس سے کم نہیں ہے، لیکن اس نے سات اہم کی نشاندہی کی ہے۔

1۔ جبلت فرار (Instinct of Plight) یعنی اپنی بقا کی خاطر انسان کا خطرات کے سامنے فرار اختیار کرنا۔

2۔ جبلت تنفر (Instinct of Repulsion) یہ بدبودار اور بدذائقہ اشیاء سے بیزاری کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔

3۔ جبلتِ تجسّس (Instinct of curiosity) یہ عجیب وغریب شے سے مشتعل ہو کر اس کے مشاہدہ کرنے سے ہوتی ہے۔ یہ ماحول اور کسی نئی اور انوکھی چیز کی تفہیم پر آمادہ کرتی ہے۔

4۔ جبلت نزاع پسندی (Instinct of Pugnacity) یہ کوئی خاص مہیج نہیں ہوتا۔ یہ جبلّت ہر جبلی فعل کے راستے میں کسی رکاوٹ کے پیدا ہونے سے بیدار ہو سکتی ہے۔ خصوصاً دشمن سے مقابلے کی صورت میں۔

5۔ جبلت خود ادعائی اور تحقیر نفس (Instinct of self-assertion and Self-abasement) دوسروں کی موجودگی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اپنے سے کمتر لوگوں کے سامنے خود ادعائی کا مظاہرہ ہوتا ہے جبکہ اپنے سے بہتر اشخاص کے سامنے عجز وانکسار کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

6۔ والدینی جبلت (Parental instinct) اس جبلت کے باعث ماں بچوں کو پالتی ہے۔ عام طور پر نر کی نسبت

مادہ میں یہ جبلت شدید ہوتی ہے۔

7۔جبلت جنسی (Sex instinct) یہ مقابل جنس کی موجودگی میں بیدار ہوتی ہے۔اور افزائش نسل کے لیے ضروری ہے۔

افادی نقطہ نظر سے انسانی جبلت کا تجزیہ کیا جائے تو انسان چند بنیادی رجحانات کے عمل اور احساس کے موروثی محرکات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔

اِن کے علاوہ میکڈوگل نے مندجہِ ذیل ثانوی جبلتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

1۔جبلتِ گروہ بندی:

یہ انسان میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے، جس کے باعث ہم جلسے، جلوسوں، کھیلوں اور میلوں میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جیل کی کوٹھری سے اِنسان اِس لئے بھی گھبراتا ہے کہ تنہا رہنے سے اِس کی گروہی جبلت کی تسکین نہیں ہوتی۔

2۔جبلتِ حصول:

اِس جبلت کے باعث چھوٹی عمر میں ٹکٹ اور سکے اور بڑی عمر میں دولت جمع کرتا رہتا ہے۔

3۔جبلتِ تعمیرات:

اِس کا مظاہرہ بچوں کے مٹی کے گھر بنانے اور کھلونے بنانے سے شروع ہوکر فنِ تعمیر تک جا پہونچتا ہے۔

یہ جبلتیں انسانی عضویہ یا کم از کم نسل انسانی کے بقاء اور تحفظ کا وظیفہ انجام دیتی ہیں۔لیکن فرد کو اس کا شعور نہیں ہوتا، کیونکہ وہ جسمانی یا ذہنی اعمال و تعملات نہیں۔ یہ عمل کے میلانات ہیں۔اور ہم انھیں صرف ان کے پیدا کردہ اعمال ہی کے ذریعے جان سکتے ہیں۔

پروفیسر مارشل نے ان موروثی رجحانات کی تقسیم درجِ ذیل جبلت کے تین بنیادی مقاصد کے تحت کی ہے۔

1۔جذبہِ بقاء (Self Preservation)

2۔جذبہءتغلّب (Self Aggression)

3۔جذبہِ بقاءِنسل (Self Procreation)

اب ہم اِن کا ترتیب وار جائزہ لے رہے ہیں۔

1۔جذبہِ بقاء (Self Preservation): اِس کے بنیادی مقاصد کے نقطہ نظر سے درجِ بالا سات اہم جبلتوں میں چار جبلتِ فرار، جبلتِ تجسس، جبلتِ تنفر اور جبلتِ نزاع پسندی شامل کی جاسکتی ہیں، جو ہماری جذبہِ بقاء میں بھوک، پیکار، فرار اور کھیل کے ذریعہ ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔

2۔جذبہءتغلّب (Self Aggression): اِس کے بنیادی مقاصد کے نقطہ نظر سے اوپر درج سات اہم جبلتوں میں دو جبلتِ خود ادعائی اور تحقیرِ نفس شامل کی جاسکتی ہے، وہ انسان کا اجتماع میں قائم جبلتوں بزم آرائی، مقبول ہونے اور ایک

دوسرے سے آگے جانے کے ذریعہ ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔

3۔جذبہِ بقاءِ نسل (Self Procreation):۔ اِس کے بنیادی مقاصد کے نقطہ نظر اوپر درج سات اہم جبلتوں میں دو والدینی جبلت اور جبلتِ جنسی شامل کی جاسکتی ہے، وہ کچھ اور جبلتوں مثلاً توالد اور والدانہ شفقت کے ذریعہ ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔

یہ سبھی جبلتیں انسانی عضویہ یا کم از کم نسل انسانی کے بقاء اور تحفظ کا وظیفہ انجام دیتی ہیں۔لیکن فرد کو اس کا شعور نہیں ہوتا، کیونکہ وہ جسمانی یا ذہنی اعمال نہیں۔ یہ عمل کے جبلی میلانات ہیں۔ اور ہم انہیں صرف ان کے پیدا کردہ اعمال ہی کے ذریعے جان سکتے ہیں۔لہٰذا حکماء کا خیال ہے کہ اِنسان کی ساری فِطرت یا اِس کے اعمال کا مآخذ یا منبع اِس کی حیوانی جبلتیں ہی ہیں۔اور وہ اپنے اعمال کی ادائیگی میں مجبورِ محض کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی مادی نظریہِ حیات ہے جس کی رو سے انسانی طبیعی مادی پیکر میں آنے کے زندگی کو ارتقاء کی آخری کڑی سمجھا جاتا ہے۔

فیصلہ آپ کا ہے

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے — شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہب مُلا و جمادات و نباتات

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں اگرچہ میرے بیان میں شوخی نہیں ہے مگر پھر بھی میں توقع کر رہا ہوں کہ شاید میری بات تیرے دل میں اتر جائے (وجہ یہ کہ بات بہت اہم ہے)

فرماتے ہیں کہ ایک صورت یہ ہے کہ بندۂ مومن کائنات کی وسعت کو دیکھے اور اس میں اللہ کی کبریائی نافذ کرے یعنی تسخیر کائنات کرے دوسری صورت یہ ہے کہ خاک کی آغوش یعنی گوشہ نشینی اختیار کر کے تسبیح کے دانے گنتا رہے۔مگر آخر میں وہ فرماتے ہیں سعی مسلسل ہی اصل دین ہے اور ان مومنین کا دین ہے جو اپنی خودی پہچانتے ہیں، خدا مست ہیں جبکہ تسبیح و مناجات کا مذہب مُلا کا ہے جو جامد اشیاء کی طرح ہے۔ہستی کی سب سے نچلی/ ابتدائی سطح جمادات اور نباتات کی ہے۔کائنات کی تسخیر ایک اعلیٰ انسان / مومن کی صفت ہے۔آپ کی مرضی ہے کہ آپ کون سا راستہ اختیار کرتے ہیں۔آپ کے اختیار میں ہے، چاہے نباتات و جمادات یعنی پیڑ اور پتھر کے درجہ میں آجائیں اور یا پھر ایک خود آگاہ اور اس تمام کائنات کو تسخیر کرنے والے اعلیٰ انسان/مومن کے رتبہ پر فائز ہو جائیں، فیصلہ آپ کا اپنا ہے۔

(خالد فاروقی، لاہور)

Is Sexual Relationship a Private Matter?

By G. A. Parwez
(Translated by: Mansoor Alam)

This is like an infection that spreads uncontrolled. But the Momineen always protect themselves from this evil virus: وَالَّذِيـــــــنَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ(42:37) – Such people abstain from heinous crimes which weaken the human 'self' as well as from acts which tend to incite universal abomination and selfishness.

From the above it is clear:

1. Sexual desire's flame is lit by thoughts.
2. The Quran calls all the malevolent factors that inflame sexual desire as haram. It calls them by the comprehensive terminology فَوَاحِشَ (or indecency).

Our society and فَوَاحِشَ (or indecency)

It is obvious that in our societyفَوَاحِشَ (or indecency) has spread like a pervasive malevolent virus. The question is: who is responsible for this? Usually the older generation blames the younger one and remains under self-deception by absolvingitself from any accountability for the spread of this malicious pandemic. This is the way people start blaming others for the spread of any pandemic but don't realize that when it started it could have been controlled by taking proper steps if people at that the helm seriously took steps to stop the spread of any virus. Since they didn't, the spread of the virus became a potent and pervasive pandemic. The Question is: who were originally responsible and when it happened? This topic is so vast that it will require several volumes to describe it. It will suffice at this time to mention that the literature and poetry that started to be written after the fall of Mughal empire was mostly فَوَاحِشَor indecency-based, and that too of a very immoraland base type. The period of downfall of any nation is very conducive and fertile ground for the spread of indecent, grotesque, and erotic literature.When a nation becomes deprived of real pleasures and ecstasy of positive and creative flow of energy for artistic and literary development during its period of downfall, then it resorts to instant tranquilized and cannibalistic pleasures ofamorous poetry and literature.

Our poetry

I cannot go into the details of this type of base and erotic poetry that was done during just after the fall of Mughal empire. Here is an illustrative example from Dagh Dehlavi:

First I met her, then it arose within
And it stays swingingin cloth within

Our traditional ode and amatory poemsare the most seductive form of so-called literary expression. What are the three characters i.e., the trinity of this kind of poetry? – the lover (the poet), the beloved, and the antagonist, the envious. It is obvious that the beloved cannot be the wife. Therefore, she will be someone's wife or sister or daughter. The beloved is presented as two types – one,free liberal showy type and the other, conservative orthodox type. The lover goes out to romance in the night to the market with his liberal beloved, both enjoy drinking and roaming around freely. But after a while when the lover loses the drive then he tells his beloved (in the words of Ghalib):

If you want to continue then you find someone else
But from time to time keep in touch with me as well

But the otherlover finds it difficult to attract his conservative beloved. But continues his romantic story with her. This is the kind of romance that one poet expressed and pleaded with God not to open file of deeds on the day of judgment:

Because in this file there are names of some veiled beloveds

Leave aside liberal romantic poets, even the conservative and religious and pious poet Hasrat Mohani presents a dramatic way of his beloved story. Here is a portion of this long poem:

I remember my tears flowing in solitude; I still remember the period I had romance with you
With countless impatience and fondness; I remember the first time my heart fell in love with you
Looking with romantic glance again and again; lifting your veil from your eyes I remember you
I became bold after meeting you and then; putting your finger within your teeth I remember you
Sometimes I lifted my window curtain; and you covering your face with scarf I remember you
I dreamed I am kissing your feet in sleep; and you kicked my head with smile I remember you
Hiding and against the wishes of others; coming to my house in the dark night I remember you
In the middle of the hot sunny day to call me; your coming to the roof bare feet I remember you
In order to put henna in hands and feet; my teasing your bare feet and hands I remember you
In spite of Hasrat being pious andreligious; those days of amorous desire, he remembers you

If this is the condition of such a religious and pious person then what to say of so-called progressive liberal poets? In this love-romanticpoetry, the meeting between the lover and the beloved always happens in the night – referred to as the "*nightof meeting*."Here are some examples of this poetry:

God knows the beloved, when will the beloved come;
Should I spread buds or full blown flowers on the bed?

Even a high level poet as Ghalib describes the "spring season has the bed in its lap" and when things move further he says:

My beloved did not appreciate dirty bed;
It was foolish of Ghalib to hurry one day!

Even such a religious person as Riyaz Khairabadi who used to pray Tahajjud says:

On meeting night, the beloved reacted angrily
When I started opening her waist band
What are you doing? What are you doing?
Don't ask what I was going to do thievishly

Riyaz Khairabadi only talks about opening the waist band. But Nazir Akbarabadi does not hide anything. But etiquette prevents me from going into this. I feel sorry that I have to present these things. But what to do? It is not possible to present the true picture of how our society has been corrupted by malevolent literature.
When the beloved pretends in the morning to be innocent after spending the night with the lover, then she is made to shut up with this type of statement:

Your scattered locks and facial color
The morning tells your night's story

Not only this. It goes on further:

Who pulled you so hard in his lap
That your picture doesn't look like you

It does not matter if she feels ashamed. Please note that I will pretend that I don't know:

I didn't understand wherefrom you came;
Just wipe the perspiration from your face

If she is veiled one and comes out of the house, then a sound comes out from behind her:

With any cloth you want to cover yourself
I know the tint of your form and appearance

We abhor that the British have officially approve homosexuality. But this custom is very old and it is mentioned with pride by our religious priesthood. The source of Urdu poetry is Persian poetry. And the entire structure of Persian poetry stands on homosexuality. There the beloveds are always young lads who serve the lovers. And this virus migrated into our poetry. Mir Taqi Mir says that he got the medicine from the boy who had made him sick. Ghalib does not even care about age in this matter. He says:

Even with fresh hair line, your forelock didn't recede
This emerald could not prevent the blow of the snake

***

I have described here briefly our cannibalistic amorous poetry and literature spread of hundreds of years – and that too only in the form of hints and suggestiveness. I avoided going into details of other media (fiction, drama, etc.) to avoid sweepingobscenities. Anyway, this is our literary inheritance!

Iqbal changed our style of poetry and serious people interested in decency felt encouraged that at least a crack has been created in the indecent realm. But unfortunately the new media (cinema, radio, and television) corrupted the environment so much that this filthy river turned into a giant flood.

The Quran has called such amalevolent period in which evil sparks will fly and touch everything: يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا (76:7) – And the entire society would become polluted and that the evil would spread far and wide. This will be a spark that will jump and enflame everywhere it touches. It seems this was being told about our period. Imagine if new generations are being raised in this environment then how can they remain protected from this amatory virus. Our orthodox religious group always blames the young generation for this evil environment. They say that the Western education has spoiled them. There is no doubt that our educational system's curriculum plays a part in this.

Our religious madrasahs

But what about our religious madrasahs? You will be surprised to find how much of the curriculum of our madrasahs is full of amatory material. Pick up any book of Fiqh. The naked obscenity you will find between man and woman will be unbearable. I have hesitatingly presented some examples of our amorous poetry. But I cannot dare to present even symbolically what vulgar issues have been discussed in the books of Fiqh. You can read yourself these books. At least please read the chapters on Ghusl and Fast in the book Hidayah or Dur-e Mukhtar. You can imagine what effect it will have on the minds of youthfrom the blatant pornographic material that is taught to them related to these issues. Moving from Fiqh let us come to hadith and tafsir of the Quran. What kind of teaching is done in our religious madrasahs could be illustrated by an example:

Here is a verse of Surah Baqarah: نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ (2:233). The

common translation of this verse is done as: Your wives are as a tilth unto you; so approach your tilth when or how youwant.In Kitabut-Tafsir of Bukhari it is described "that this verse was revealed because some men used to have anal intercourse with their wives." From this the debate started whether or not having anal intercourse with wife is allowed. Allama Badruddin 'Aini and Hafiz Ibne Hajar 'Asqalani have written the exposition of Bukhari. They havepresented detailed discussion about this tafsir of Bukhari. They mentioned many sayings of different Imams. For example, Allama 'Aini has written about Imam Malik:

Muhammad bin Saad has quoted Abu Sulaiman Jauzani who said: I went to Imam Malik bin Anas and asked him about anal intercourse. Then he put his hand on his head and said that I am coming just now from bath after having anal intercourse. Ibne Qasim has similarly quoted Imam Malik who said I did not find any man who had any doubts about anal intercourse with women and that it is halal in matter of Deen.

This is an example of what is taught through hadith and tafsir in religious madrasahs.You can very well imagine what kinds of thoughts will be going through the minds of the youth when discussions will be happening on this issue in the classroom environment. For example, what the students will be feeling when such as below narration, that is in Bukhari, is presented to them:

Narrated Abu Huraira:

The Prophet Solomon son of the Prophet David said, "Tonight I will go round (i.e. have sexual relations with) one hundred women (my wives) every one of whom will deliver a male child who will fight in Allah's Cause." On that an Angel said to him, "Say: 'If Allah will.' " But Solomon did not say it and forgot to say it. Then he had sexual relations with them but none of them delivered any child except one who delivered a half person. The Prophet (ﷺ) said, "If Solomon had said: 'If Allah will,' Allah would have fulfilled his (above) desire and that saying would have made him more hopeful."[Bukhari: Kitabul Jihad]

***

Mr. Maududi's teachings

These were some examples that are taught in our orthodox religious schools. But majority of college students are under the influence of Jamaat-e Islami. Please note what the students are taught pertaining to prisoners of war. Mr. Maududi writes in his Tafheemul Quran:

The government has the right to release the women prisoners of war; or it can release them for ransom; or it can exchange for Muslim prisoners; or it can make them concubines and distribute them to Muslim soldiers who could use them in any way they like. [Tafheemul Quran, Edition 1, page 340]

He has further explained this in his another book thus: 1) one can have sex with the concubines without Nikah; 2) there is no limit how many concubines one can have; and 3) their owners can transfer the concubines to whomever they want and the can also sell them. [Tafheemaat, Vol.2, pp. 290-324]

To Be Continued

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

8- بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

9- ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلندترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

10- چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہوجائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمد گر مدغم ہوجائیں گے۔

11- جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوجاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی رد و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

12- قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

13- قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہوسکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کرسکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

14- جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

15- ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

16- طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.74
ISSUE
07

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web: www.toluislam.org www.facebook.com/talueislam/

وَكَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰى وَمَنۡ حَوۡلَهَا وَتُنۡذِرَ يَوۡمَ الۡجَمۡعِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ ؕ فَرِيۡقٌ فِى الۡجَنَّةِ وَفَرِيۡقٌ فِى السَّعِيۡرِ ۝

تمہاری طرف سے صاف اور واضح ضابطۂ قوانین اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ تم، اس کے ذریعے، اس مرکزی بستی (مکہ) اور اس کے اردگرد کی آبادیوں کو ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج وعواقب سے آگاہ کردو۔ اور انہیں متنبہ کردو کہ (اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آئے، تو اس کشمکش کے آخری فیصلہ کے لئے، تمام لشکر میدان میں جمع ہوں گے۔ پھر ایک گروہ، (فاتح ومنصور حیثیت سے) جنتی معاشرہ میں داخل ہوگا اور دوسرا فریق (خاسر ونامراد) تباہیوں کے جہنم میں جا گرے گا۔ ان سے کہہ دو کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں (یہ اس دنیا میں بھی ہوگا اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی)۔ (مفہوم القرآن، سورۃ الشوریٰ:7)

